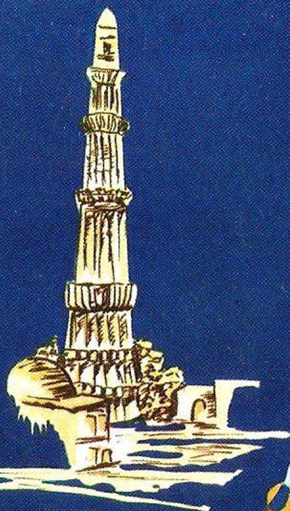
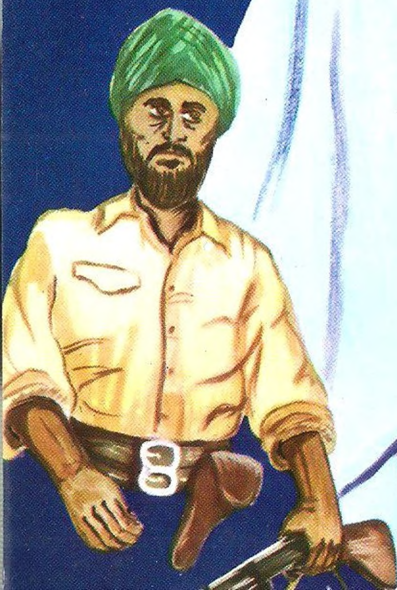
حاتم طائی دِلّی میں



ا ے۔ حمید





دُوسرا حِصّہ

حاتم طائی دِلّی میں

بچّوں کے لیے ناول

اے حمید



فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

غیر مجلد: 969 0 00636 3

ترمیم شدہ __________ ۲۰۱۱ء

فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ

ہیڈ آفس و شوروم: 60۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

راولپنڈی آفس: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔

کراچی آفس: فرسٹ فلور، مہران ہائٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔

حاتم طائی دِلّی میں	Hatam Tai Delli Mein
اے۔حمید	A. Hameed

مطبوعہ فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام ظہیر سلام پرنٹر و پبلشر

email:support@ferozsons.com.pk

www.ferozsons.com.pk

اژدہے کے پیٹ میں

حاتم طائی کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو اندھیرے میں پایا۔ اُسے یُوں لگا جیسے وہ کسی دَل دَل میں پھنسا ہوا ہے، جو اُوپر نیچے ہِل رہی تھی۔ اُس نے ٹٹول کر دیکھا۔ دیواریں گیلی گیلی سی تھیں، جیسے گوشت کی بنی ہوں۔ اچانک وہ خوف سے کانپ اُٹھا۔ وہ اژدہے کے پیٹ میں تھا!

ایک بار تو اس کے پسینے چھُوٹ گئے۔ اگرچہ اُسے یقین تھا کہ وہ ہر حالت میں زندہ رہے گا، لیکن اِس خیال سے اس کی رُوح لرز گئی کہ وہ ایک خُون خوار اژدہے کے پیٹ میں ہے، اور وہ اسے ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصل میں جب حاتم بے ہوش ہو کر گرا تھا تو اژدہے نے اُسے نِگل لیا تھا۔ حاتم نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اُس کا سر اژدہے کے پھیپھڑوں سے

جا لگا، جو سانس لے رہے تھے۔ اُس کے پاؤں بھی اژدہے کے معدے میں ٹخنوں تک دھنسے ہُوئے تھے۔ اچانک، اندھیرے میں، کوئی شے اس کی پنڈلی سے لپٹ گئی۔ اُس نے جلدی سے اُسے پکڑ کر اُوپر کھینچا۔ وہ ایک سانپ تھا جسے اژدہے نے تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا اور جو اَدھ مُوا ہو رہا تھا۔ حاتم نے اس کی گردن مروڑ کر اُسے وہیں پھینک دیا۔

معدے میں حاتم طائی کے ہلنے جُلنے سے اژدہا بھی بڑا پریشان تھا۔ وہ اپنی طرف سے حاتم کو ہڑپ کرکے بڑے مزے سے مُورتی کے سر پر جاکر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ خُوش تھا کہ ایک مُدّت کے بعد اُسے زندہ اِنسان کھانے کو مِلا ہے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ حاتم زندہ تھا۔ اُس نے اژدہے کے معدے سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور اپنی کمر کو ٹٹولا۔

اس کی کمر میں خنجر ویسے ہی لگا تھا۔ اژدہا اُسے کپڑوں، جُوتوں اور خنجر سمیت نگل گیا تھا۔ اُس نے خنجر نکالا اور اللہ کا نام لے کر اژدہے کا پیٹ چاک کر دیا۔ اُسے پیٹ کے اندر ہی اژدہے کی چیخ کی آواز سُنائی دی۔ اژدہا ایک قلا بازی کھا کر

مُورتی کے سر سے نیچے گرا۔ حاتم بھی اُلٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر دُوسرا وار کیا۔ اژدہے کے پیٹ میں ایک دروازہ سا کھُل گیا۔ حاتم لپک کر باہر آ گیا۔ روشنی میں آتے ہی اُس نے سب سے پہلے جو چیز دیکھی وہ اژدہے کی لاش تھی، جو فرش پر تڑپ رہی تھی۔

پھر وہ اُٹھ کر مُورتی کی طرف بڑھا۔ اژدہے کی موت کے بعد مُورتی کی آنکھوں سے سُرخ شعائیں زیادہ تیزی سے نکلنے لگی تھیں۔ حاتم کا سارا جسم تیز روشنی میں سُرخ ہو گیا تھا۔ ان شعاعوں میں موت کا اثر تھا مگر حاتم اُن کے اثر سے محفُوظ رہا۔ دیوی کے بُت کے پاؤں کے پاس ایک راستہ تھا جو شاہی محل کے خزانے کو جاتا تھا۔ اسی خزانے کے دروازے پر مردِ بُزرگ کے اس بیٹے کا جادُوئی پُتلا تھا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا اور جس کی تلاش میں حاتم طائیِ پاکستان سے اِس جزیرے میں آیا تھا۔

حاتم دروازے کی طرف بڑھا تو دیوی کے بُت کا دس من وزنی ہاتھ اُوپر کو اُٹھا اور دھم سے حاتم

کے سر پر ہتھوڑے کی طرح آن گرا۔ مگر حاتم پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ اِس کے بجائے بُت کا ہاتھ ٹوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہُوئی اور دیوی کی آنکھوں کی روشنی ایک دم بُجھ گئی۔ دیوی کا جادُو ختم ہو چُکا تھا۔ حاتم بُت کے پاؤں کے پاس بنے ہُوئے دروازے میں داخل ہوکر آگے بڑھا۔ اب اس کا راستہ صاف تھا۔

لیکن اس دوران میں جاکُوف جادُوگر کو، جو جزیرے کے بادشاہ کا وزیر بھی تھا، دیوی کی شکست کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ فوراً ہی تہہ خانے کی طرف آیا۔ حاتم خزانے کے دروازے پر پہنچ چُکا تھا کہ جاکوف نے منتر پڑھ کر حاتم پر پھُونک ماری۔ ایک ہاتھی سے بھی اُونچا اور بھاری بھرکم دیو، جس کے بارہ ہاتھ اور بارہ آنکھیں تھیں، لمبے لمبے دانت نکال کر حاتم کی طرف بڑھا۔

حاتم نے خُدا کو یاد کیا اور پھر قُلابہ کا بتایا ہُوا اِسم پڑھ کر دیو کو غائب کر دیا۔ لیکن جاکوف اِتنی جلدی ہار ماننے والا نہ تھا۔ اس نے ایک دُوسرا منتر پڑھا۔ اب ایک شعلہ زمین سے اُٹھا، جس

نے دیکھتے ہی دیکھتے حاتم طائی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ شعلہ چھت سے باتیں کر رہا تھا۔ حاتم کا اس میں بھسم ہو جانا یقینی تھا، مگر وہ زندہ رہا۔ آگ نے اس پر ذرا اثر نہ کیا۔

جاکوف جادوگر پریشان ہو گیا۔ اس کے پاس بس ایک آخری منتر رہ گیا تھا۔ اس نے اسے بھی آزمانے کا فیصلہ کیا اور پھونک مار کر ایک بہت بڑے مُنہ والے بھیانک شیر کو حاتم کے سامنے لا کھڑا کیا۔ شیر کی دہاڑ سے تہہ خانے کے در و دیوار ہل گئے اور چھت کے دو تین پتھر نیچے آن گرے۔ اتنا خوف ناک شیر حاتم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مُنہ پھاڑے دہاڑتا ہوا حاتم کی طرف بڑھا۔ حاتم نے اسم پڑھا اور اس پر پھونک مار کر کہا:

"جاکوف کو ہڑپ کر جا!"

شیر اُلٹے پاؤں پیچھے مُڑا اور اس سے پہلے کہ جاکوف فرار ہو سکے، اسے ثابت کا ثابت نگل گیا۔ حاتم نے دُوسری بار شیر پر پھونک مار کر کہا "غائب ہو جا!" اور دیکھتے ہی دیکھتے شیر غائب ہو گیا۔ اب جادوگر بھی غائب ہو گیا تھا اور اُس کا

طلسمی شیر بھی ۔قُلّابہ کا اِسم جاکوف پر غالب آ گیا تھا۔
اس کام سے فارغ ہو کر حاتم خزانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ حاتم کو یہی بتایا گیا تھا کہ اس دروازے پر طلسمی پُتلا ننگی تلوار ہاتھ میں لیے پہرا دیتا ہے اور جو شخص دروازے میں قدم رکھے، اسے فوراً ہلاک کر دیتا ہے۔ خزانے میں ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے تھے، اور سونے کی اینٹیں چھت تک چُنی ہُوئی تھیں۔
مگر طلسمی پُتلا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔حاتم کو اپنی موت کا تو کوئی خوف تھا ہی نہیں۔ اُس نے اللہ کا نام لیا اور خزانے کے اندر داخل ہو گیا۔ ابھی اُس نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک طرف سے تلوار کا بھرپُور وار اُس کی کھوپڑی پر پڑا۔ ایک بار تو وہ بوکھلا کر رہ گیا، کیوں کہ وار بڑا زبردست تھا اس کی جگہ کوئی گینڈا بھی ہوتا تو اس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ اُس کی گردن پر تلوار کا دُوسرا وار پڑا۔ یہ وار اِتنا بھرپُور تھا کہ جھن جھناہٹ کے ساتھ تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

اب حاتم نے دیکھا کہ اُس کے سامنے طلسمی پُتلا کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ خُون کی طرح سُرخ تھا اور اس میں سے آگ کے شُعلے سے نکل رہے تھے۔ یہی وہ نوجوان تھا جس کی تلاش میں حاتم طائی یہاں آیا تھا۔ طلسمی پُتلا لوہے کی کسی مشین کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ تلوار ٹوٹ جانے کے بعد وہ حاتم کی طرف بڑھا اور اُسے دونوں ہاتھوں سے اُٹھاکر زمین پر پٹخنے کی کوشش کی، مگر حاتم اپنی جگہ پتّھر بنا کھڑا رہا۔

حاتم نے سوچا کہ اِس پتلے کو یہاں سے کیسے لے جایا جائے؟ آخر ایک ترکیب اُس کے ذہن میں آگئی۔ اُس نے قُلابہ دیوی کا بتایا ہوا اسم پڑھا اور طلسمی پُتلے کی طرف اشارہ کر کے کہا :

"پتّھر کا چُوہا بن جا!"

اور دُوسرے ہی لمحے طلسمی پُتلا پتّھر کا ایک چھوٹا سا چُوہا بن کر زمین پر پڑا تھا۔ حاتم نے اُسے اُٹھا کر جیب میں رکھا اور سُرنگ میں واپس آ گیا۔

واپسی پر سُرنگ کا راستہ صاف تھا۔ وہ باہر

جنگل میں نکل آیا اور ٹیلوں کی اوٹ میں، گھنی جھاڑیوں اور گنجان درختوں سے گزر کر، شارجہ جادوگرنی کے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔ شارجہ جادوگرنی نے حاتم کو دیکھ کر پُوچھا:

"معلوم ہوتا ہے تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

حاتم طائی نے جیب سے پتّھر کا چُوہا نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور کہا "یہ ہے وہ طلسمی پُتلا جسے میں نے جادُو کے زور سے پتّھر کا چُوہا بنا دیا ہے۔ اب اس پر تم اپنا منتر پڑھو تاکہ یہ پھر سے ایک ہوش مند نوجوان کی شکل میں آ جائے اور میں اسے اُس کے باپ کے پاس پہنچا دُوں۔"

شارجہ جادُوگرنی نے پتّھر کے چُوہے کی گردن تین بار کاٹ کر اُس پر باری باری منتر پڑھا۔ پھر تیسری بار گردن جوڑنے کے بعد کہا:

"اب تم اسے اِنسان کی شکل دے سکتے ہو۔ یہ ہوش میں آ چکا ہے۔ اس پر سے جاکوف کے جادُو کا اثر ختم ہو چکا ہے۔"

حاتم نے دیوی تُقلابہ کا اسم پڑھ کر چُوہے کو

حکم دیا کہ وہ پھر سے زندہ اِنسان کے رُوپ میں آ جائے۔ پلک جھپکنے میں وہاں پتھر کے چوہے کی جگہ ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے حیرانی سے چاروں طرف دیکھ کر بولا :

"میں کہاں ہُوں ؟ میرا باپ اور بھائی کہاں ہیں ؟"

حاتم نے اُسے بتایا کہ اس کا باپ پاکستان کے ایک شہر ساہیوال میں ہے اور اس کا بھائی جاکوف کے جادُو کی وجہ سے مر گیا ہے۔ نوجوان نے غُصّے سے پُھنکارتے ہُوئے کہا :

"میں جادُوگر جاکوف کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی جا کر اس کی گردن مروڑ دُوں گا۔"

حاتم نے کہا کہ اب اس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس نے جاکوف سے اس کے بھائی کا بدلہ لے لیا ہے اور وہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔

"اب تم میرے ساتھ اپنے باپ کے پاس چلو۔ وہ تمھاری جُدائی میں آنسُو بہا رہا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔"

حاتم نے شارجہ جادوگرنی سے اجازت لی اور نوجوان کو ساتھ لے کر جادوگرنی کے بھائی کے پاس آ گیا۔ اس نے طلسمی پُتلے کو انسانی شکل میں دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ رات اُنھوں نے جنگل میں بسر کی۔ دُوسرے روز محل میں شور مچ گیا کہ شاہی خزانے کا طلسمی پُتلا غائب ہے اور وزیر کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔

سارے جزیرے میں بادشاہ کے سپاہی وزیر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ طلسمی پُتلے کا حُلیہ بھی انھیں بتا دیا گیا تھا، اور بادشاہ نے حُکم دے دیا تھا کہ وہ جہاں کہیں نظر آئے، اُسے پکڑ کر شاہی محل میں لایا جائے۔ جادوگرنی کے بھائی نے حاتم طائی اور طلسمی پُتلے والے نوجوان کو دو تین روز تک جنگل میں چھُپائے رکھا۔

اس عرصے میں جادوگرنی کے بھائی نے ایک کشتی تیّار کروائی جس میں کھانے پینے کا اتنا سامان رکھ دیا گیا جو ایک مہینے تک کے لیے کافی تھا۔ پھر ایک رات جب کہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا، حاتم طائی نے نوجوان کو ساتھ لیا، جادوگرنی کے

بھائی سے اِجازت لی اور کشتی میں بیٹھ کر کھُلے سمُندر کی طرف نکل کھڑا ہُوا۔

رات بھر کشتی سمُندر میں چلتی رہی۔ کشتی میں ایک اُونچا سا بادبان لگا ہوا تھا اور ہَوا موافق تھی دن نِکلا تو کشتی، جزیرے سے بہُت دُور، سمُندر میں نِکل آئی تھی۔ اس طرح چھ دن اور پانچ راتیں سمندر میں سفر کرنے کے بعد آخر اُنھیں ساحل نظر آیا۔

یہ اُن کی خُوش قِسمتی تھی کہ کشتی ٹھیک سَمت میں سفر کرتی رہی اور وہ خلیج فارس کی ایک بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ ایک جہاز میں سوار ہو کر کراچی آ گئے۔ کراچی پہنچ کر حاتم طائی نے اپنے لیے عربی چُغہ اور عمامہ خریدا اور نوجوان نے کوٹ پتلون خرید کر پہن لیا۔ پھر وہ کراچی ایکسپریس میں بیٹھ کر ساہیوال پہنچے تو پتا چلا کہ نوجوان کا باپ مُلتان جا چُکا ہے۔

مُلتان پہنچ کر نوجوان اپنے باپ سے ملا۔ دونوں گلے مِل کر خُوب رُوئے۔ جب اُن کا غم ہلکا ہوا تو حاتم نے کہا:

”اے مردِ بزرگ، میں نے تمھارا سوال پُورا کر دیا ہے اور تمھارا بیٹا تمھیں مل گیا ہے۔ اب مجھے اجازت دو تاکہ میں واپس لاہور جا کر دُوسرے انسانوں کے کام آ سکوں۔“

مردِ بزرگ سے اجازت لے کر حاتم طائی ٹرین میں سوار ہوا اور سیدھا لاہور آ گیا۔ جزیرے کے بادشاہ کے خزانے میں کروڑوں روپے کا سونا تھا مگر حاتم نے کسی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اُس کے پاس ابھی تک تھوڑا سا سونا تھا، اور اس نے اُسے کراچی میں فروخت کر کے اپنا اور نوجوان کا لباس اور ٹکٹ خریدے تھے۔

اِس وقت اس کے پاس کوئی تین سو روپے تھے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ پاکستان کے تاریخی مقامات ہڑپا اور موئن جو دڑو کی سیر کرے۔ ایک رات اُس نے ہوٹل میں بسر کی۔ دُوسرے روز نہا دھو کر، ناشتا کر کے، ریلوے سٹیشن جانے والی بس کا اِنتظار کر رہا تھا کہ ایک عورت کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ایک کھمبے کے پاس کھڑی ہر نوجوان کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

"پیارے بیٹے کمال، تُم آ گئے! آؤ بیٹا! میرے پاس آؤ۔ میں تمھاری ماں ہُوں۔"

عورت پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہی تھی۔ حاتم اُس کے پاس جا کر بولا:

"اے غم زدہ خاتون، تمھارا بیٹا کہاں کھو گیا ہے جو تُم اُسے سڑکوں پر تلاش کر رہی ہو؟"

عورت نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے حاتم کو دیکھا اور کہا "میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ ڈھاکے میں گڑبڑ ہُوئی تو وہ کِسی طرح وہاں سے نِکل کر دِلّی چلا گیا۔ وہاں سے اُس کا خط آیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ وہ سرحد پار کر کے پاکستان آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس بات کو آٹھ برس بیت گئے ہیں۔ جب سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں راتوں کو روتی رہتی ہُوں۔ دن میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو لاہور کی سڑکوں پر تلاش کرتی پھِرتی ہُوں۔ خُدا جانے وہ دن کب آئے گا جب میرا کمال مجھے مِلے گا!"

حاتم کے دِل پر عورت کی ماتما کا گہرا اثر ہُوا۔ اُس نے کہا "فکر نہ کرو، ماں۔ میں تمھارے بیٹے کمال کو تلاش کر کے ایک دِن تمھارے پاس لے

آؤں گا۔ کیا تم مجھے اس کی کوئی تصویر دے سکتی ہو؟"
عورت حاتم کو اپنے مکان میں لے گئی اور ٹرنک میں سے بیٹے کی تصویر نکال کر اُسے دی۔ یہ ایک اُنیس بیس سال کے ایک خوش شکل نوجوان کی تصویر تھی جس کے بال گھُنگھریالے تھے، اور سب سے بڑی نشانی یہ تھی کہ اُس کا ایک طرف کا کان تھوڑا سا کٹا ہُوا تھا۔ حاتم طائی نے تصویر جیب میں رکھی اور عورت کو تسلّی دے کر کہا:

"ماں جی، آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ میں آج ہی آپ کے بیٹے کی تلاش میں جا رہا ہُوں۔ اِن شاءاللہ اسے بہُت جلد اپنے ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہُوں گا۔"

عورت کو یقین نہیں آ رہا تھا، پھر بھی اُس نے حاتم کو دُعائیں دیں اور وہ اجازت لے کر باہر آ گیا۔

اب اُس نے سوچا کہ ہندوستان میں کِس طرح سے داخل ہو! اُس کے پاس نہ تو پاسپورٹ تھا اور نہ ویزا، اور اِس طرح سرحد پار کرنا خطرناک تھا۔ مگر دُوسری طرف غم نصیب ماں کا تڑپتا ہوا دِل تھا جو اپنے بیٹے کی یاد میں رو رہا تھا۔ حاتم نے بہُت

سے دُکھی لوگوں کی مدد کی تھی۔ اس نے ہر دُکھی اِنسان کے جائز سوال کو پُورا کیا تھا۔ وہ اس دُکھی ماں کی بھی مدد کرنا چاہتا تھا۔ پس وہ اللہ کا نام لے کر، اندازے سے، مشرق کی سمت روانہ ہو گیا۔ اُسے صرف اِتنا ہی معلوم تھا کہ اُدھر سے ہندوستان کی سرحد شرُوع ہوتی ہے۔

حاتم طائی جس زمانے سے تعلُق رکھتا تھا، اور جس دُنیا سے نِکل کر ہماری آج کی سائنسی دُنیا میں آیا تھا، وہاں پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اگر وہ ہندوستان کا ویزا حاصِل کرنے کی کوشش بھی کرتا تو اِنکار کر دیا جاتا، کیوں کہ اُن کا کوئی رشتے دار ہندوستان میں نہیں رہتا۔ لیکن اُس کا جانا بھی ضروری تھا۔ ایک ماں کے تڑپتے ہُوئے دِل کا سوال تھا۔ اُس کے بچھڑے ہوئے بیٹے کی زندگی کا سوال تھا۔ خُدا جانے وہ کہاں تھا! کِس حال میں تھا! حاتم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس دُکھی عورت کا بیٹا کمال زندہ ہوا تو وہ اُسے ایک نہ ایک دن ضرور اس کی ماں کے پاس لے آئے گا۔

شالا مار سے کافی آگے جا کر بس رُک گئی۔ دُوسری سواریوں کے ساتھ حاتم طائی بھی بس سے اُتر گیا۔ اُس وقت سُورج ڈُوب رہا تھا، اور تھوڑی روشنی تھی۔ حاتم رات کے اندھیرے میں سرحد پار کرنا چاہتا تھا۔ پس وہ سڑک کے کنارے ایک چائے خانے میں جا کر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ گرمیاں شرُوع ہو چکی تھیں لیکن دُھوپ میں ابھی تپش نہیں تھی۔

جب شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو حاتم نے چائے کے پیسے دیے اور ہوٹل سے نکل کر جنُوب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

بھیانک رات

اُسے دُور، کسی گاؤں کی روشنیاں نظر آئیں۔

وہ اس گاؤں کی طرف بڑھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایک دکان کے باہر تیل کا لیمپ جل رہا تھا اور دُکان میں کوئی آدمی بیٹھا کڑاہی میں دُودھ گرم کر رہا تھا۔ اس نے حاتم کو عربی لباس میں

دیکھا تو حیرانی سے پُوچھا:
"کیا تم دوبئی سے آئے ہو؟"
حاتم نے کہا "ہاں۔" وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"اِدھر کیا کر رہے ہو؟ کس سے مِلنا ہے؟" دکان دار نے سوال کیا۔
حاتم نے کہا "تم مجھے کوئی نیک آدمی معلُوم ہوتے ہو۔ میں تُم سے جھُوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے پاس پاسپورٹ اور ویزا نہیں ہے، مگر میرا دِلّی پہنچنا بہُت ضرُوری ہے۔ کیا تم سرحد پار کرانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟"
دکان دار نے پہلے حاتم طائی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اس کی بات تو نہیں سُن رہا۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو بولا:
"اس گاؤں سے دو کوس آگے، ایک اور گاؤں آئے گا۔ اس میں چھ سات کچّے مکان ہوں گے۔ اس کے قریب سے گزرو گے تو ایک نہر آئے گی۔ نہر کے پار چلے جانا۔ وہاں ایک کھائی ملے گی۔ اُس

کھائی سے آگے بھارت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

حاتم طائی نے کہا "بھائی، تمھارا بہت بہت شکریہ۔ اِس سے زیادہ مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔"

حاتم نے تھوڑا سا گرم دودھ پیا اور اللّٰہ کا نام لے کر اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ دو کوس چلا ہو گا کہ کچھ دور روشنی دِکھائی دی۔ یہ اُسی گاؤں کی روشنی تھی۔ حاتم اس گاؤں کے قریب سے گزرا تو دو کتّے بھونکتے ہوئے اس کی طرف بڑھے وہ ایک درخت کے تھڑے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتّے پہلے تو تھڑے کے اِرد گِرد گھوم گھوم کر بھونکتے رہے، پھر تھڑے کے اُوپر چڑھ آئے۔ بڑے خوں خوار قسم کے جنگلی کتّے تھے۔ حاتم کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔

حاتم نے کتّوں کو تھڑے پر چڑھ کر حملہ کرتے دیکھا تو وہ درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کی شاخ پر بیٹھ کر وہ اِنتظار کرنے لگا کہ کتّوں کی مصیبت دور ہو تو نیچے اُترے۔ وہ یونہی کتّوں کو پتھر

نہیں بنانا چاہتا تھا۔ آخر تھک ہار کر کُتّے واپس چلے گئے۔

اب حاتم درخت پر سے اُترا اور آگے روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد نہر آ گئی، جو کافی چوڑی تھی۔ حاتم کِنارے کِنارے چلتا ہوا ایک پُل پر آ گیا۔ یہاں سے اُس نے نہر عبُور کی اور دُوسری طرف کھیتوں میں سے ہو کر آگے بڑھا۔ رات کی تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھر گیا تھا۔ خُوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کوئی آبادی قریب نہیں تھی۔

آگے بڑھا تو ایک کھائی دِکھائی دی، جو خشک تھی اور اس میں جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ دکان دار کی اِطلاع کے مُطابق اُس سے آگے بھارت کا علاقہ شرُوع ہوتا تھا۔ کھائی میں اندھیرا تھا۔ جھاڑیوں میں ایک تنگ کچّا راستہ بنا تھا۔ معلُوم ہوتا تھا یہاں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ حاتم اس راستے پر سے گزُر کر کھائی پار کر گیا۔ جب وہ کھائی کے دُوسرے کِنارے پر آیا تو اُس نے دیکھا کہ سامنے، ستاروں کی دھیمی روشنی میں،

دُور تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک کچّا راستہ اُن کے بیچ میں سے جاتا تھا۔

حاتم اُس پگ ڈنڈی پر چلتا گیا۔ اب کھیت ختم ہو گئے تھے اور بنجر میدان آ گیا تھا۔ یہاں اُونچی اُونچی جھاڑیاں تھیں۔ اچانک اُسے دُور سے جیپ آتی دکھائی دی۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھُپ گیا۔ جیپ اس کے قریب آکر ذرا دیر کو رُکی۔ حاتم نے جھاڑیوں میں سے دیکھا۔ جیپ میں سبز وردی پہنے تین سکھ سوار تھے۔ یہ بھارتی سرحدی پولیس کے سپاہی تھے جو رات کی گشت پر پھر رہے تھے۔ جیپ سے اُتر کر ایک سکھ سپاہی نے دُور بین لگا کر دیکھا اور بولا :

"کوئی نہیں ہے، بھئی۔ آگے چلو"

اور پھر وہ جیپ میں سوار ہو گیا۔ جیپ بڑی تیزی سے گرد کے بادل اُڑاتی آگے روانہ ہو گئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو حاتم جھاڑیوں کے پیچھے سے نکلا اور آگے روانہ ہو گیا۔ اب وہ پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا، کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ وہ بھارتی علاقے میں داخل ہو چکا ہے

اور کسی طرف سے بھی سنسناتی ہُوئی گولی آسکتی ہے۔
پاس ہی گنّے کا ایک کھیت تھا۔ حاتم اس کی مینڈھ پر چڑھنے لگا تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور وہ ہوا میں دس فُٹ اُوپر اُچھل کر دوبارہ زمین پر آگرا۔ یہ سارا علاقہ بارُودی سُرنگوں سے بھرا ہوا تھا اور حاتم کا پاؤں ایک بارُودی سُرنگ پر پڑ گیا تھا۔ یہ سُرنگیں بھارتی فوجوں نے بچھا رکھی تھیں۔ دھماکے کی آواز پر، یکے بعد دیگرے، تین روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے۔ سارا علاقہ روشن ہوگیا۔ حاتم بھاگ کر ایک گڑھے کے اندر چھُپ گیا۔
دو بھارتی سپاہی بھاگتے ہُوئے وہاں آئے۔ انھوں نے اُس جگہ کو غور سے دیکھا، جہاں بارُودی سُرنگ پھٹی تھی۔ اُنھوں نے سوچا، کسی سمگلر کا پاؤں بارُودی سُرنگ پر آگیا ہوگا اور اس کی لاش کے پُرزے اُڑ گئے ہوں گے۔ پھر بھی اُنھوں نے اِدھر اُدھر مشین گن کی گولیوں کے دو چار بَرسٹ مارے اور واپس چلے گئے۔ جب کافی وقت گزر گیا' اور حاتم کو یقین ہوگیا کہ اب وہاں کوئی نہیں آئے گا تو وہ گڑھے میں سے نکلا اور تیزی سے دُوسری

طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

اب وہ بھارت کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ کوئی ایک گھنٹا چلتا رہا۔ اب وہاں بنجر میدان نہیں تھے بلکہ گندم کے کھیت تھے۔ دُور اندھیرے میں گھنے درختوں کا جُھنڈ دکھائی دیا جہاں کسی مکان میں ایک دِیا جل رہا تھا۔ حاتم اِس جُھنڈ سے بچتا ہُوا دُوسری طرف نِکلا تو ایک کچّی سڑک آ گئی۔ یہ سڑک ختم ہوئی تو وہ ایک پکّی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک بس سٹاپ تھا، جس کا شیڈ بنا ہُوا تھا اور اس میں ایک ٹُوٹا پُھوٹا لکڑی کا بینچ پڑا تھا۔

سڑک آگے بھی جاتی تھی، لیکن آگے راستہ کچّا تھا۔ پکّی سڑک صرف بس سٹاپ تک ہی تھی۔ اچانک امرتسر شہر کی طرف سے ٹرک کی آواز سُنائی دی۔

حاتم بس سٹاپ کے ایک کونے میں چُھپ گیا۔ وہ شیڈ کی لکڑی کی دیوار کے سوراخ میں سے ٹرک کو آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک نہیں، چھ سات ٹرک تھے اور اِن میں بھارتی فوجی سوار تھے۔

تمام ٹرک ایک ایک کر کے حاتم کے سامنے سے گُزر گئے، لیکن آخری ٹرک بس سٹاپ سے ذرا

دُور جاکر رُکا ، اور دو سپاہی چھلانگ لگا کر نیچے اُترے۔ ایک سپاہی جُھک کر پہیّے کو دیکھنے لگا۔ دُوسرا بولا :

" کوئی اِینٹ لاکر اسے ٹھونکو۔ نہیں تو آگے جاکر پہیّا نکل جائے گا "

" اینٹ کہاں سے لاؤں ؟ "

" وہ سامنے بس سٹاپ ہے۔ وہاں جاکر دیکھو۔ ایک آدھ مِل جائے گی "

حاتم پریشان ہو گیا۔ سِکھ سپاہی ، بندُوق کندھے سے لٹکائے ، بس سٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حاتم شیڈ میں سے کِھسک کر باہر کھیت کی مُنڈیر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ سپاہی نے بس سٹاپ پر آکر اینٹ تلاش کرنی شرُوع کر دی۔ خُوش قِسمتی سے اُسے وہاں ایک اِینٹ مِل گئی ، نہیں تو وہ ضرور اُس کھیت میں جاتا جہاں حاتم چُھپا ہوا تھا۔ پھر حاتم کو مجبُوراً یا تو اُسے پتھر بنانا پڑتا یا غائب کرنا پڑتا۔ لیکن اس کی تلاش میں دُوسرے سپاہی وہاں ضرور آتے اور یُوں ایک مُصیبت کھڑی ہو جاتی۔ اگرچہ حاتم کو یہ لوگ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے ،

مگر اُسے پاکستانی جاسُوس سمجھ کر گرفتار ضرور کر لیتے اور جس کام کے لیے وہ آیا تھا وہ ادُھورا رہ جاتا۔

سپاہی نے اینٹ سے پہیّے کا بولٹ ٹھونکا، پھر اینٹ دُور پھینکی اور ٹرک میں سوار ہو گیا۔

حاتم نے اندازہ لگایا کہ یہ ٹرک مورچوں میں بیٹھے ہندوستانی سپاہیوں کے لیے سامان لے کر جا رہے ہیں۔ جلد ہی تمام ٹرک رات کے اندھیرے میں گُم ہو گئے اور پھر اُن کی گھرر گھرر کی آواز بھی آنا بند ہو گئی۔

ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ حاتم کھیت میں سے نکل کر بس سٹاپ کے پاس آ گیا۔ اُس نے سڑک کی طرف دیکھا۔ یہ سڑک بھارت کے پہلے بڑے سرحدی شہر امرتسر کو جاتی تھی۔

حاتم نے اِس سڑک پر امرتسر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ جس سڑک پر وہ جا رہا تھا وہ چھوٹی تھی۔ آگے جا کر یہ سڑک بڑی جرنیلی سڑک سے مل گئی۔ یہ وہ سڑک تھی جو واہگہ بارڈر سے امرتسر جاتی ہے۔ یہاں حاتم نے ایک پتھر پر ہندی اور انگریزی میں، سفید حرُوف میں، امرتسر 25 کلومیٹر لکھا دیکھا۔

آدھی رات گُزر چکی تھی ۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اندھیرا تھا ۔ تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں درختوں کے سائے بڑے خوف ناک دِکھائی دے رہے تھے ۔ بائیں طرف کسی مندر کا کھنڈر تھا ، جس کے باہر ایک بہُت بڑے درخت کی چھاؤں میں ایک اندھا کُنوّاں تھا۔ حاتم یہاں سے گُزرنے لگا تو اُسے ایک آواز سُنائی دی :

"کوئی پیاسے کو پانی پلائے گا ؟"

حاتم رُک گیا ۔ آواز کسی عورت کی تھی اور اُس میں اِلتجا تھی ۔ پہلے تو وہ ڈر گیا کہ کون عورت ہے جو آدھی رات کو سُنسان سڑک پر بیٹھی لوگوں سے پانی مانگ رہی ہے ۔ پھر اُس پر اِنسانی ہمدردی غالب آ گئی ۔ حاتم نے کبھی کسی کا سوال رد نہیں کیا تھا ۔ وہ ہر مُصیبت زدہ کی مدد کرتا تھا، اور اُس کا سوال پُورا کرنے کی کوشش کرتا تھا ۔

جس طرف سے آواز آئی تھی، حاتم اُسی طرف بڑھا۔ آواز اندھے کنویں کی طرف سے آ رہی تھی اور وہاں بہُت اندھیرا تھا ۔ وہ کُنویں سے کوئی پچاس

قدم دُور تھا کہ وہی آواز پھر آئی۔ حاتم نے دیکھا کہ کُنویں کی منڈھیر پر ایک خوُب صُورت عورت، زیورات سے لدی پھندی بیٹھی ہے اور اُسے اِشارے سے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

حاتم اُس عورت سے پانچ قدم کے فاصلے پر جاکر رُک گیا۔ عورت کے چہرے کا رنگ نیلا نیلا سا تھا اور آنکھوں سے سُرخ سُرخ شُعلے سے نکل رہے تھے۔ وہ حاتم کی طرف دیکھ کر بولی:

"تُم بڑے اچھّے آدمی ہو۔ مجھے اِس کُنویں سے پانی نکال کر پلاؤ گے؟"

حاتم نے کہا "میرے پاس ڈول اور رسّی نہیں ہے۔ کُنویں میں سے پانی کیسے نکالُوں؟"

عورت نے دونوں بازُو اُٹھا کر کنویں کی طرف اِشارہ کیا اور بولی "یہاں آکر دیکھو۔ رسّی بھی ہے، ڈول بھی ہے۔"

حاتم نے کہا "اگر رسّی بھی ہے اور ڈول بھی ہے تو پھر تُم خُود کیوں نہیں پانی نکال لیتیں؟ لوگوں کو آوازیں کیوں دے رہی ہو؟"

عورت نے ایک قہقہہ لگایا اور اِس قہقہے کی

آواز سے آس پاس کا سارا علاقہ گونج اُٹھا۔ اب جو حاتم نے دیکھا تو کنویں کی منڈیر پر خوب صورت عورت کی جگہ ایک بدصورت، لمبے لمبے دانتوں والی، چڑیل بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیر اُلٹے تھے اور اگلے دانت ہاتھی کے دانتوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ بلند کرکے، خوف ناک قہقہے مارتی، کنویں کی منڈیر سے اُٹھی اور حاتم کی طرف بڑھی۔

حاتم طائی کا دل دھڑکنے لگا۔ ایسی خوف ناک اور بھیانک شکل والی چڑیل اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی لال لال زبان باہر کو لٹک رہی تھی۔ آنکھیں آگ اُگل رہی تھیں۔ سر کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر حاتم پتھّر کا بن گیا تھا۔ اُس کے پاؤں من من کے ہو گئے تھے۔ اُس نے بھاگنا چاہا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لیے ہیں۔

چڑیل ایک دم فضا میں بلند ہوئی اور حاتم کی گردن دبوچ کر اپنے لمبے نوکیلے دانت اس کی گردن کی طرف بڑھائے لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ وہ جس شخص کا خون پینا چاہتی ہے، وہ اس کا بھی باپ ہے

جُوں ہی اُس نے پُوری طاقت سے حاتم کی گردن پر دانت مارے، کھٹاک کی آواز کے ساتھ اُس کے اگلے دونوں دانت نیچے گر پڑے۔ حاتم نے ہاتھ اُٹھا کر چُڑیل کو بالوں سے پکڑ لیا۔ چُڑیل ہکّا بکّا رہ گئی کہ یہ کِس جن بھُوت سے پالا پڑ گیا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ کوئی راہ گیر ہے اور وہ اُسے مزے سے کھا جائے گی۔ لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

اب حاتم اپنے حواس میں آ چُکا تھا، اور مقابلے کے لیے بالکل تیّار تھا۔ چُڑیل کے بال پکڑ کر اس نے اُسے تین چکّر دیے اور پھر پُوری طاقت سے اُوپر اُچھال دیا۔ چُڑیل کے مُنھ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکراتی ہُوئی، اُوپر ہی اُوپر، اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

چُڑیل کی ڈراؤنی آوازیں بند ہُوئیں تو فضا میں ایک دِل ہِلا دینے والا سنّاٹا چھا گیا۔ رات گویا سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔ دُور کھیتوں کی جانب سے کِسی کُتّے کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی۔

پھر جیسے کُتّا چیخ مار کر رونے لگا۔ اِس کے بعد آہستہ آہستہ اُس کے رونے کی آواز دُور ہوتی گئی۔

یہ اندھا کنواں آسیبی تھا اور یہاں ایک چڑیل رہتی تھی۔ اِس طرف دن میں بھی لوگ آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ حاتم نے چڑیل کو بھگا کر لوگوں کو اِس سے نجات دلا دی تھی۔ اب وہ سڑک پر آگیا اور ایک بار پھر امرتسر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ اب کارخانوں کا سِلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کارخانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی کارخانوں کے دروازے بند تھے تھوڑی دیر بعد ایک بستی آئی۔ یہاں اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ حاتم کو سُنسان سڑک پر جاتے دیکھ کر ایک کُتّا تھوڑی دیر بھونکا، پھر خاموش ہو گیا۔

امرتسر کا شہر قریب آگیا تھا۔ ایک جگہ ریلوے پُل نظر آیا۔ یہاں ایک چوکیدار رات کی گشت پر تھا۔ حاتم کو اُس نے غور سے دیکھا اور اُس کے عربی لباس پر تعجّب کرتے ہوئے بولا:

"تم کون ہو، بھائی جی؟"

حاتم نے کہا "میں ایک اِنسان ہُوں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ مگر تم نے لباس کیسا پہن رکھا ہے؟"

حاتم نے کہا "میں عرب سے آیا ہوں۔"

چوکیدار نے کہا "اچھا، تم سیّاح ہو۔"

"ہاں، میں سیّاح ہوں۔"

چوکیدار نے پوچھا "مگر آدھی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اِس سوال کا جواب حاتم کے پاس نہ تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ پھر جلد ہی سنبھل کر بولا "میں ایک تاریخی عمارت دیکھنے آیا تھا کہ راستہ بھول گیا۔ اب واپس امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر جا رہا ہوں سٹیشن کو یہی راستہ جاتا ہے نا؟"

چوکیدار نے گہری نظروں سے حاتم کو دیکھا۔ اُسے حاتم پر کچھ شک سا ہو رہا تھا۔ پھر کہنے لگا "ہاں، یہی راستہ جاتا ہے۔"

حاتم تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھا۔ وہ چوکیدار سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ اُس کی منزل ابھی بہت دُور تھی۔ دُور سے امرتسر ریلوے سٹیشن کی لال اور سبز بتّیاں

نظر آنے لگیں۔ ایک ٹرک حاتم کے قریب سے گزر گیا۔ پھر پولیس کی ایک جیپ اس کے قریب سے نکل گئی۔

امرتسر کا ریلوے سٹیشن آ گیا تھا۔ حاتم طائی نے سوچا کہ وہ یہاں سے دلّی کا ٹکٹ لے کر ٹرین میں سوار ہو جائے گا اور دلّی پہنچ کر اُس دُکھی عورت کے گمشدہ بیٹے کمال کو تلاش کرے گا۔ اُس نے انکوائری آفس سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ جنتا ایکسپریس نام کی ایک ٹرین صُبح سوا سات بجے امرتسر سے دلّی کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ حاتم نے سٹیشن کلاک پر وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ پیدل چل کر بارڈر سے یہاں تک آیا تھا اور بہت تھک گیا تھا۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ رات کا باقی حصّہ کسی ہوٹل میں گزارا جائے۔

سٹیشن کے سامنے ہی ایک ہوٹل تھا۔ حاتم ہوٹل میں گیا تو ایک لڑکا کاؤنٹر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ حاتم نے اُس سے ایک کمرا کرائے پر لیا۔ لڑکے نے حاتم کے عربی لباس کو غور سے دیکھا۔

حاتم نے محسوس کیا کہ اُس کا عربی لباس لوگوں کے دِلوں میں طرح طرح کے شک پیدا کر رہا ہے، لیکن حاتم عرب کا باشندہ تھا اور وہ اپنا قومی لباس تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے دِل میں کہا :

"نہیں، نہیں۔ میں عربی لباس نہیں بدلوں گا۔ لوگ شک کرتے ہیں تو کرتے پھریں۔"

حاتم نے ہوٹل والے سے کہ دیا تھا کہ وہ اُسے صُبح چھ بجے جگا دے، کیوں کہ اُسے جنتا ایکسپریس سے دِلّی جانا ہے۔

صُبح پُورے چھ بجے نوکر نے آکر حاتم کو جگا دیا۔ حاتم نے جلدی جلدی ناشتا کیا، ہوٹل کا بل ادا کیا اور پھر سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ جنتا ایکسپریس پلیٹ فارم پر تیّار کھڑی تھی۔ مُسافر سوار ہو رہے تھے۔ حاتم کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ ہمیشہ بغیر سامان کے سفر کرتا تھا۔ بس ایک چھوٹا سا بریف کیس اُس نے لاہور کے انارکلی بازار سے خرید لیا تھا، جس میں ضرورت کی چند ایک چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں بیٹھ

گیا۔ اپریل کا مہینا تھا۔ گرمی شروع ہو چکی تھی۔ مگر چوں کہ صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی گرمی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی میں بازو رکھے سوچ رہا تھا کہ وہ اُس دُکھی ماں کے بیٹے کمال کو دِلّی میں کس جگہ جاکر تلاش کرے! اس کا آخری خط دلّی سے ہی آیا تھا۔

یہ ایک مشکل کام تھا، کیوں کہ حاتم کو کمال کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ دو تین برس پہلے دِلّی میں تھا۔ ہاں، کمال کی ایک تصویر حاتم کے پاس ضرور تھی جو اُس کی ماں نے اس کو دی تھی۔ وہ اِسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اُس نے محسوس کیا کہ دو آنکھیں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی ہیں۔

وہ جس ڈبّے میں بیٹھا تھا، اُس کے بالکل سامنے، پلیٹ فارم پر، ایک بینچ پڑی تھی اور اُس بینچ پر ایک سِکھ بیٹھا اُسے گھور رہا تھا۔ یہ سی آئی ڈی انسپکٹر تھا اور اُسے حاتم پر شک ہو گیا تھا کہ وہ بھارت میں جاسوسی کرنے آیا ہے۔ حاتم نے بھی محسوس کرلیا کہ سِکھ انسپکٹر کی نیّت نیک نہیں۔ مگر اُس نے

کوئی خاص پروا نہ کی اور کمال کے بارے میں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد انجن نے آخری سیٹی بجائی اور گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری رفتار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔

ڈبے میں بہت سے مسافر تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا اور کوئی سیٹ پر لیٹا سو رہا تھا اور کوئی کھڑکی میں بیٹھا باہر کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ دو ایک مسافروں نے حاتم سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے تو حاتم نے وہی پرانا جواب دہرا دیا کہ وہ کویت میں کاروبار کرتا ہے اور کاروبار کے سلسلے میں بھارت آیا ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی، کیوں کہ کویت اور بحرین کے عرب سوداگر ہندوستان آتے جاتے رہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ٹرین جالندھر سے تھوڑی دور ادھر رک گئی۔ شاید سگنل ڈاؤن نہیں ہوا تھا۔ حاتم باہر دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے وہی سکھ انسپکٹر

پھر نظر آیا۔ وہ حاتم کے ڈبّے کی طرف تیز تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ ڈبّے میں سوار ہو کر وہ حاتم کے قریب آکر بیٹھ گیا اور انگریزی کا اخبار نکال کر پڑھنے لگا۔

اب سگنل ڈاؤن ہو چُکا تھا۔ اِنجن نے چیخ ماری اور چھک چھک کرتا آگے بڑھا۔ جالندھر سٹیشن پر ٹرین رُکی تو سِکھ اِنسپکٹر نے چائے منگوائی اور حاتم کو ایک پیالی پیش کر کے بولا:

"لیجیے، حضرت۔ آپ مُلکِ عراق سے آئے ہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ میرا تعلّق کویت سے ہے۔ میں وہاں سپیئر پارٹس کا کاروبار کرتا ہُوں۔ امرتسر ایک دُکان دار سے ملنے آیا تھا۔ اب دلّی واپس جا رہا ہُوں۔"

حاتم نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا تاکہ انسپکٹر بار بار سوال کر کے اس کا سر نہ کھائے۔ لیکن اِنسپکٹر نے ایک ایسا سوال کر دیا جس کا جواب حاتم کے پاس نہ تھا۔ اُس نے پُوچھا:

"آپ کے پاس پاسپورٹ اور ویزا ہے؟"

ایلورا کے ڈراؤنے غار

حاتم طائی بوکھلا سا گیا۔ کیوں کہ اس کے پاس ہندوستان کا ویزا نہیں تھا۔ انسپکٹر تیز نگاہوں سے اُسے گھور رہا تھا۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ حاتم طائی بغیر ویزے کے سفر کر رہا ہے، اور غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ حاتم کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس زمانے کا آدمی تھا جب دُوسرے مُلکوں میں داخل ہونے کے لیے کسی پاسپورٹ یا ویزے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ حاتم نے کہا:

"دراصل میرا پاسپورٹ دِلّی میں میرے ہوٹل میں ہے اور اس میں انڈیا کا ویزا ہے۔"

اُس نے شاید زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا اور وہ بھی اس خیال سے کہ خواہ مخواہ کی بک بک جھک جھک سے بچ جائے اور اس کا سفر کھوٹا نہ ہو۔ لیکن جھوٹ بول کر اُسے افسوس بھی ہُوا۔ اُس نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ آیندہ ساری زندگی کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔

انسپکٹر کو حاتم کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اُس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ آپ بغیر پاسپورٹ کے سفر کر رہے ہیں۔ آپ کو اگلے سٹیشن پر میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا"۔

حاتم پریشان ہو گیا۔ دُوسرے مُسافر بھی حاتم کو شک کی نظروں سے تکنے لگے، جیسے وہ کسی مُلک کا جاسُوس ہو اور اُن کے مُلک کے خُفیہ راز حاصل کرنے آیا ہو۔

"سردار صاحب، آپ کا نام کیا ہے؟" حاتم نے انسپکٹر سے پُوچھا۔

اِنسپکٹر نے کہا "اِس سے آپ کو کیا؟"

حاتم نے کہا "میں دِلّی پہنچ کر آپ کو مطمئن کر سکتا ہُوں۔ میرا سفر خراب نہ کریں۔ میرا دِلّی پہنچنا بہت ضروری ہے"۔

انسپکٹر کہنے لگا "فکر نہ کریں۔ لُدھیانے پہنچ کر ہم آپ کے ہوٹل میں فون کر کے پاسپورٹ کا پُوچھ لیں گے۔ اگر آپ کا بیان ٹھیک ہوا تو آپ دُوسری ٹرین سے جا سکیں گے"۔

حاتم نے کہا "آپ خوامخواہ ایک شریف غیرملکی

مہمان کو پریشان کر رہے ہیں "

انسپکٹر بولا " ہم کسی غیر ملکی مہمان کو پریشان نہیں کرتے۔ لیکن جو شخص ہمارے ملک میں جاسوسی کرنے آئے، اسے ہرگز نہیں چھوڑتے "

حاتم نے کوئی جواب نہ دیا، کیوں کہ بات خوامخواہ لمبی ہو رہی تھی۔ دوسرے مسافروں نے بھی انسپکٹر کا ساتھ دیا اور اس سے کہا کہ حاتم کو فوراً گرفتار کرلے۔ حاتم نے مسکرا کر مسافروں کی طرف دیکھا اور کہا:

" میں چاہوں تو آپ لوگوں کو ابھی غائب کرسکتا ہوں "

اس پر مسافر زور زور سے ہنسنے لگے۔ ایک لالہ جی بولے " مہاراج، آپ جادوگر ہیں کیا؟ "

حاتم نے کہا " میں جادوگروں کا بھی استاد ہوں "

مسافر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ ایک نے کہا " کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے "

انسپکٹر نے حاتم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا " آپ جادوگروں کے استاد ہیں تو فکر نہ کریں۔ میں جادوگروں کے استادوں کا بھی استاد ہوں "

اِتنے میں لدھیانے کا سٹیشن آ گیا اور ٹرین رُک گئی۔ انسپکٹر حاتم کو ساتھ لے کر گاڑی سے اُتر گیا۔

حاتم تمام لوگوں کے سامنے اپنی طاقت ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ٹرین بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے انسپکٹر کو کندھے سے پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا اور کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ اِنسپکٹر نے جیب سے چھوٹی سی ایک ٹیوب نکال کر اُس کی ناک کے آگے کر دی اور بٹن دبا دیا۔

ٹیوب میں سے گیس نکل کر حاتم کے نتھنوں میں گھُس گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ انسپکٹر نے ریلوے پولیس کو مدد کے لیے بُلا لیا۔

جب حاتم کو ہوش آیا تو وہ ایک کوٹھڑی میں بند تھا جس کے دروازے پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، اور ایک پولیس والا رائفل لیے باہر پہرا دے رہا تھا۔ حاتم کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ انسپکٹر نے اُسے گیس سُنگھائی تھی جس سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

اُسے سخت پیاس لگی تھی۔ اُس نے سپاہی سے پانی مانگا تو اُس نے سلاخوں کے پاس مُنہ کر کے کہا:

"تمھیں پانی نہیں ملے گا۔ خبردار! آگے کوئی بات نہ کرنا۔ بس چُپکے بیٹھے رہو۔"

حاتم کو بڑا غُصّہ آیا۔ یہ کم بخت تو بالکل جانوروں کا سا سلُوک کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔ بلکہ لوگ تو جانوروں کو بھی پانی پلا دیتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اب ان لوگوں کو زیادہ مُہلت نہیں دینی چاہیے اور انھیں ملیا میٹ کرکے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ پھر اچانک اُسے ایک خیال آیا۔ کیا خبر، اس عورت کا بیٹا کمال بھی اسی کی طرح جیل میں قید ہو۔ اُس کے بارے میں یہاں سے معلُومات حاصل کرنی چاہیے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا، اور خاموش ہو رہا۔

کوٹھڑی میں کوئی روشن دان نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوٹھڑی زمین کے اندر کسی تہہ خانے میں تھی۔ وہاں ٹھنڈ سی تھی اور باہر ایک پھیکا سا بلب روشن تھا۔ حاتم چُپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا کہ وہی سِکھ انسپکٹر اندر آ گیا۔ اُس کے پہلُو میں پستول لٹک رہا تھا اور وہ انسپکٹر کی وردی میں تھا۔ حاتم کے پاس آ کر

وہ سٹول پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر اُس کو گھورنے کے بعد بولا :

"جس ہوٹل کا پتا تم نے بتایا تھا اُس نام کا دِلّی میں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ اگر تم مُصیبت سے بچنا چاہتے ہو تو جو میں پُوچھوں، سچ سچ بتاتے جاؤ۔ نہیں تو ساری زندگی اس کوٹھڑی میں سڑتے رہو گے۔"

حاتم نے کہا "پہلے مجھے پانی پلایا جائے۔"

اِنسپکٹر نے سپاہی کو اشارہ کیا اور وہ گلاس میں پانی لے آیا۔ حاتم نے پانی پیا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ اُس نے کہا :

"اب پُوچھو، کیا پُوچھنا چاہتے ہو؟"

اِنسپکٹر نے حاتم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا "تمھارے عِلاوہ اور کون کون بھارت میں جاسُوسی کر رہا ہے؟"

حاتم طائی نے کچھ سوچ کر کہا "ایک لڑکا کمال دِلّی میں ہے۔ مجھے اُس سے مِلنے کے لیے کہا گیا تھا۔ شاید وہ چاندنی چوک میں کہیں رہتا ہے۔"

"کمال نام کا ایک نوجوان اس وقت ہماری قید میں ہے۔ وہ بڑا خطرناک جاسُوس ہے۔ ڈھاکے

سے دِلّی آیا تھا۔"

حاتم کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ جو کچھ وہ جاننا چاہتا تھا، اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ پتا کرنا باقی تھا کہ کمال کس شہر میں ہے۔ اُس نے انسپکٹر سے کہا:

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ کمال بڑا ہوشیار جاسوس ہے۔ آپ لوگ اُسے گرفتار نہیں کر سکتے۔"

حاتم نے انسپکٹر کو اُکسایا تھا کہ وہ اس طرح اُس شہر کا نام بتا دے گا جہاں کمال سزا بھگت رہا تھا۔ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ایک بار پھر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ انسپکٹر نے تاؤ میں آ کر کہا:

"تم بھارت کی خُفیہ پولیس سے واقف نہیں ہو۔ ہماری خُفیہ پولیس زمین کے نیچے سے جاسوس کو پکڑ کر لے آتی ہے۔ کمال اس وقت گُل برگہ کی جیل میں پڑا سڑ رہا ہے اور وہیں پڑے پڑے ایک دِن مر جائے گا۔"

حاتم کا مقصد پُورا ہو گیا تھا۔ اب وہ وہاں سے نِکل کر پہلے دِلّی اور پھر وہاں سے گُل برگہ جانا چاہتا تھا۔ اُس نے اچانک اپنا لہجہ بدل کر

سِکھ اِنسپکٹر سے کہا :

" سُنو سردار جی ! اب میں تمھاری قید سے آزاد ہو رہا ہُوں ، اور تم کیا، تمھارا سارا تھانہ بھی مجھے نہیں روک سکے گا "

انسپکٹر نے پیٹی میں سے پستول نکال کر کہا " تمھاری لاش ہی یہاں سے جائے گی "

حاتم نے دِل ہی دِل میں قُلابہ کا بتایا ہوا اِسم تین بار پڑھا اور پھر کہا " اِنسپکٹر کا پستول غائب ہو جائے ! "

اور اس جُملے کے ساتھ ہی انسپکٹر کے ہاتھ میں پکڑا ہُوا پستول ایک دم غائب ہو گیا ۔ وہ گھبرا کر سٹول پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور چلّا کر پہرے دار سپاہی کو حُکم دیا " فائر کر دو ، اِس پر ! "

سپاہی نے دھائیں سے گولی داغ دی ۔ گولی حاتم کے پیٹ سے ٹکرا کر اُس کی جھولی میں آن گری ۔ اس نے گرم گرم گولی سِکھ اِنسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا :

" اِسے میری نشانی سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو "

انسپکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ایک بار پھر چلّا کر کہا "فائر کرو! ٹھیک نشانہ لگاؤ!"

پہرے دار نے اُوپر تلے تین فائر کیے۔ تینوں گولیاں حاتم کے دل کے قریب جا کر لگیں، لیکن فوراً اس کے پتّھر ایسے سخت سینے سے ٹکرا کر اُس کی جھولی میں آن گریں۔ اس نے گولیاں اُٹھا کر سپاہی کی طرف پھینک دیں اور کہا:

"انھیں اپنے پاس رکھو۔ شاید تمھارے کام آئیں اور اب سنبھل جاؤ۔ اب میری باری ہے!" یہ کہ کر اُس نے سپاہی کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"پتّھر بن جا!"

سپاہی رائفل کندھے پر رکھ کر ایک اور گولی چلانا چاہتا ہی تھا کہ ایک دم پتّھر کا بُت بن کر، اُسی طرح، اسی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ انسپکٹر نے سپاہی کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ دھم سے، دیوار کی طرح، فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پتّھر کی طرح سخت تھا۔

اب تو انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سمجھ گیا کہ اُس کا پالا کسی زبردست جادوگر

سے پڑا ہے۔ حاتم نے اِشارے سے انسپکٹر کو اپنی طرف بُلایا اور کہا:

"کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ گُل برگہ شہر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

انسپکٹر نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا "گُل برگہ صوبہ آندھرا میں ہے اور یہاں سے بہُت دُور ہے۔ لدھیانے سے دلّی اور پھر وہاں سے آگے جانا پڑے گا۔"

حاتم طائی نے انسپکٹر کے کندھے ہلاتے ہُوئے پُوچھا "اب تمھارا کیا اِرادہ ہے؟"

اِنسپکٹر نے ہاتھ جوڑتے ہُوئے کہا "مُجھے معاف کر دیں۔ مُجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مُجھے معلُوم نہ تھا کہ آپ کون ہیں۔"

حاتم نے کہا "تو پھر چلو، مجھے باہر چھوڑ آؤ۔"

انسپکٹر نے حاتم طائی کو ساتھ لیا اور تہہ خانے سے نکال کر جیل کے بڑے دروازے پر لے آیا۔ اُسے انسپکٹر کے ساتھ دیکھ کر کسی نے بھی شک نہ کیا کہ وہ فرار ہو رہا ہے۔ پہرے دار نے اُسی وقت جیل کا پھاٹک کھول دیا اور انسپکر حاتم کو ریلوے سٹیشن لے گیا۔

اُس وقت دِن کا ایک بج رہا تھا۔ حاتم طائی نے پلیٹ فارم پر کچھ سینڈوچ بنوا کر کھائے اور ٹھنڈا شربت پیا۔ انکوائری آفس سے معلوم ہُوا کہ دِلّی جانے والی گاڑی چار بجے آئے گی۔ وہ چار بجے تک پلیٹ فارم پر ہی اِنتظار کرتا رہا۔ ٹھیک چار بج کر دس منٹ پر امرتسر سے ایک ٹرین آ گئی۔ اُس میں رش کافی تھا۔ حاتم نے فسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا۔ اُسے بڑی آرام دہ سیٹ مل گئی۔

رات کے تین بجے گاڑی دِلّی ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئی۔ یہ شہر مُسلمانوں کی عظمت کی یادگار ہے۔ یہاں بادشاہوں کے مقبرے، محل اور قلعے اور بڑی بڑی مسجدیں ہیں۔ حاتم کو آگے جانا تھا۔ رات اُس نے سٹیشن پر ہی گزاری اور دُوسرے روز صُبح نو بجے آندھرا جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ یہ کافی لمبا سفر تھا۔ حاتم نے دو تین دن کے سفر میں نئے نئے لوگ دیکھے۔ نئی نئی بولیاں سُنیں۔ رائچور سٹیشن سے گاڑی بدلنی پڑی۔ یہاں سے گُل برگہ چالیس میل دُور تھا۔ آخر وہ گُل برگہ شہر پہنچ گیا۔

اب اُسے کمال کو تلاش کرنا تھا۔ اِس کے لیے

ضروری تھا کہ وہ جیل میں جائے۔ قدرت نے اُسے یہ موقع بھی دے دیا۔ اِس علاقے کی بولی حاتم کی سمجھ سے باہر تھی۔ بہت کم لوگ اُردو میں بات کرتے تھے۔ ایک جگہ حاتم نے چائے پی اور منہ ہاتھ دھو کر باہر سڑک پر کھڑا تھا کہ ایک آدمی اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا، اور اُس نے ٹھنڈی پتلون اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے حاتم سے پاسپورٹ دِکھانے کو کہا۔ حاتم طائی بھی چاہتا تھا کہ کوئی اُسے سمگلر یا جاسوس سمجھ کر جیل خانے میں لے جاکر بند کر دے۔ اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا:

"میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔"

وہ آدمی چونکا "کیا تم بغیر پاسپورٹ کے یہاں آئے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے آدھی رات کو چھپ کر سرحد پار کی تھی۔"

"تو پھر تمھیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

"چلو، میں تیار ہوں۔"

حاتم اس آدمی کے ساتھ گلبرگہ شہر کے بڑے

تھانے میں گیا۔ یہاں اس سے پُوچھ گچھ کی گئی تو اُس نے بتایا کہ وہ سیر کرنے آیا ہے۔

"میں عرب سے آیا ہُوں اور تقریبًا ڈیڑھ ہزار سال پہلے وہاں سے چلا تھا"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ پولیس انسپکٹر نے کہا "مسٹر حاتم، تُم اپنے آپ کو پاگل بتا کر ہمارے چُنگل سے نہیں بچ سکتے۔ تمھیں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی"

"میں جیل کی ہوا کھانے کے لیے تیّار ہُوں"

حاتم طائی کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ اُس نے یہ معلُوم کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ کمال نام کا نوجوان یہاں کس جگہ قید ہے۔ جیل کی کوٹھڑی میں وہ اکیلا ہی بند تھا۔ رات ہو گئی، مگر کوئی آدمی اُس کے پاس نہ آیا۔ آخر ایک قیدی نے اُسے تھوڑے سے اُبلے ہُوئے چاول اور ٹین کے ڈبّے میں پانی دیا۔ یہ کالا بھُجنگ آدمی تھا اور خُوش قسمتی سے مُسلمان تھا۔ حاتم نے کہا:

"بھائی، مجھے یہ بتاؤ کہ کمال نام کا ایک نوجوان یہاں کس جگہ قید ہے؟ میں اُسی کی تلاش میں اِس

شہر میں آیا ہوں۔"

قیدی نے چونک کر حاتم کو دیکھا اور پھر پوچھا "وہ تمھارا کون ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بس یہی سمجھ لو۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟"

قیدی اُٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے تک گیا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی اُن کی باتیں نہیں سُن رہا تو اُس نے کہا:

"کمال کو پاکستان کا جاسُوس ہونے کے اِلزام میں پولیس نے پکڑ رکھا ہے۔ کل تک وہ اِسی جیل میں تھا۔ اب سُنا ہے اُسے ایلورا کے غاروں میں بند کر دیا گیا ہے۔"

"یہ ایلورا کے غار کہاں ہیں؟"

"شہر سے باہر پہاڑیوں میں ہیں۔ جیل کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک سڑک، شہر سے باہر، پہاڑیوں میں جاتی ہے۔ اس سڑک پر چلتے جانا۔ کافی دُور جا کر ایک دریا ملے گا۔ دریا پار کر جانا۔ پھر ایک پہاڑی آئے گی۔ اِس کے دامن میں ایلورا کے غار ہیں۔

"ایک غار کے باہر مہاتما بُدھ کا بُت بنا ہوا ہے۔

اُس غار میں پولیس ان لوگوں کو لے جاتی ہے جن پر جاسوس ہونے کا شک ہوتا ہے" قیدی نے اُسے بتایا اور پھر چونک کر کہنے لگا "شاید وارڈن گشت پر آ رہا ہے۔ اب میں جاتا ہوں"

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ حاتم کو جس طرح کی معلومات چاہیے تھیں، وہ اُسے مل گئی تھیں۔ اب اُسے جیل سے فرار ہونا تھا۔ وہ رات ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو وہ اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔ وہاں ایک مرہٹہ سپاہی پہرا دے رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر رائفل تھی اور وہ کوٹھڑی کے آگے ٹہل رہا تھا۔ حاتم طائی نے اُسے اپنے پاس بُلا کر کہا:

"تم غائب ہونا پسند کرو گے، پتّھر بنتا پسند کرو گے، یا مجھے یہاں سے باہر نکالو گے؟"

مرہٹے نے رائفل کا رُخ حاتم کی طرف کرتے ہوئے کہا "میں تمھیں گولی مارنا پسند کروں گا۔ چلو! پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ!"

حاتم طائی نے کہا "بہت اچھا۔ تمھارا علاج بھی کرنا ہی پڑے گا"

یہ کہہ کر اُس نے قلابہ کا بتایا ہوا اِسم پڑھا اور مرہٹے پر پھُونک مار کر کہا " پتھّر ہو جا پیارے !"

اور مرہٹہ وہیں کھڑے کھڑے پتھّر بن گیا ۔ حاتم کوٹھڑی سے باہر نکل آیا مگر ابھی پُورا جیل خانہ طے کرنا باقی تھا ۔ وہ بڑے سکُون سے جیل کے بڑے پھاٹک کی طرف چلا ۔ اندھیری رات تھی، مگر بارکوں میں روشنی ہو رہی تھی ۔ اچانک دروازے کے پاس ایک سپاہی نے حاتِم کی گردن پر رائفل کی نال رکھ کر کہا :

" خبردار ! رُک جاؤ ، نہیں تو گولی چلا دُوں گا"۔

حاتِم نے اُسے بھی پتھّر بنایا اور بڑے پھاٹک پر آ گیا ۔ یہاں پہرے دار نے اُسے دیکھا تو سیٹی بجا دی ۔ سیٹی کی آواز پر ساری جیل میں ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ تمام سپاہی بندوقیں لے کر دروازے کی طرف بھاگے ۔ مگر اِس دوران میں حاتِم پھاٹک سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہو چُکا تھا ۔ سپاہی اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور وہ ایک گڑھے میں چھُپا بیٹھا تھا ۔ جب سپاہی اُس کے قریب سے ہو کر ایک طرف کو نکل گئے تو وہ

گڑھے سے باہر نکلا اور قیدی کے بتائے ہُوئے کچّے راستے پر ایلورا کے غاروں کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس قسم کا علاقہ حاتم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زمین پتھّریلی تھی۔ راستے میں کنکر بکھرے ہُوئے تھے۔ اندھیرا بڑا گہرا تھا۔ آسمان پر ستارے کہیں کہیں نظر آ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں دائیں بائیں پھیلی ہُوئی تھیں۔ اس نے دریا کا پُل عبُور کیا تو سامنے پہاڑیاں دِکھائی دیں۔ انھی پہاڑیوں میں ایلورا کے غار تھے۔ وہ چلتا گیا۔ آخر اس غار کے آگے پہنچ گیا جہاں گوتم بُدھ کا بُت بنا ہُوا تھا۔

غار کے باہر ایک کالا بُھجنگ مرہٹہ سپاہی مشین گن لیے پہرا دے رہا تھا۔ حاتم طائی بے دھڑک اُس کے پاس چلا گیا۔ پہرے دار نے مشین گن کا مُنھ اُس کی طرف کرتے ہوئے زور سے کہا "ہالٹ!"

حاتم نے پہرے دار کی مشین گن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بھائی، خُدا جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے اس غار کے اندر جانا ہے۔"

پہرے دار نے غُصّے سے مشین گن کو ذرا پیچھے ہٹایا تاکہ وہ حاتم کے سر کا نشانہ لے سکے، لیکن

حاتم نے اُسے مشین گن چلانے کی مُہلت ہی نہ دی اور ایک زور دار ہاتھ مار کر مشین گن کے دو ٹکڑے کر دیے۔ سپاہی خوف زدہ ہو گیا۔ حاتم نے اُس کی گردن پر ایک ہاتھ مارا تو وہ لڑکھڑا کر مُنہ کے بل گِرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اب حاتم غار کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑا پُراسرار اور ڈراؤنا غار تھا۔ چھت پانچ فٹ اُونچی تھی۔ دونوں طرف، دیواروں پر، ہندو دیوی دیوتاؤں کی ڈراؤنی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ آگے لوہے کا جنگلا تھا، جس نے غار کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ حاتم نے اسم پڑھ کر دروازہ ہی غائب کر دیا کیوں کہ اُسے واپس بھی آنا تھا۔

آگے بڑھا تو سیڑھیاں نظر آئیں جو نیچے جاتی تھیں۔ یہاں پہنچ کر اُسے کسی کے کراہنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ اس آواز کی سمت چلا۔ اچانک ایک قہقہہ بلند ہوا اور ساتھ ہی چیخ کی آواز اُبھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو شدید اذیّت دی جا رہی ہے۔ ذرا آگے چل کر بائیں طرف ایک دروازہ آ گیا، جو کھُلا تھا۔ حاتم نے دروازے کی جھری

میں سے جھانکا۔ اندر کا منظر بڑا ہی بھیانک تھا۔ تین نوجوان ایک تختے سے بندھے پڑے تھے، دو آدمی اُن کے سروں پر کھڑے ان کے جسموں پر گرم گرم سلاخیں لگا رہے تھے اور ایک مرہٹہ فوجی افسر اُن سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میز پر اُس کی مشین گن پڑی تھی۔ حاتم خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔

سلاخیں لگانے والے آدمیوں نے حاتم کو دیکھا تو چیخ کر کہا "کون ہو تم؟"

فوجی افسر پیچھے کو پلٹا، مگر اس عرصے میں حاتم نے میز پر رکھی ہوئی مشین گن اُٹھا لی تھی اور اس کی نال کا رُخ افسر کی کھوپڑی کی طرف کر دیا تھا:

"ہاتھ اُوپر اُٹھا لو! جلدی!"

تختے سے بندھے ہوئے نوجوان حاتم کو حیرانی سے دیکھنے لگے کہ یہ رحمت کا فرشتہ یہاں کیسے آ گیا! اُس کے عربی لباس سے ان نوجوانوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور اُن کی مدد کرنے کے لیے آیا ہے۔ مرہٹہ فوجی افسر لومڑی کی سی چمکیلی آنکھوں

سے حاتم طائی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سپاہی حاتم پر حملہ کرنے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ اچانک ایک سپاہی نے جیب سے پستول نکال کر حاتم پر فائر کر دیا۔ لیکن گولی حاتم کی گردن پر لگ کر نیچے گر پڑی۔ حاتم نے بھی جواب میں مشین گن چلا دی۔ دونوں سپاہی زخمی ہو کر گر پڑے۔ فوجی افسر نے چلّا کر کہا :

"میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ مجھے نہ مارنا"

جیٹ طیّارے کا اِغوا

حاتم طائی نے ایک نوجوان کی رسّیاں کھول دیں، اور اُس سے کہا "اس فوجی افسر کے ہاتھ پیر باندھ دو"

قیدی نوجوان کم خوراک ملنے اور تکلیفیں سہنے کی وجہ سے اگرچہ بہت کمزور ہو گیا تھا، مگر آزادی نے اُس کے اندر نئی رُوح پھُونک دی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور مرہٹے کو اُسی تختے پر لِٹا کر رسّی سے جکڑ دیا۔ حاتم نے کہا :

"اب ان دونوں کو بھی کھول دو۔"

تینوں نوجوان آزاد ہو گئے تو حاتم نے زخمی مرہٹہ سپاہیوں کے پاؤں بھی تختے سے کس کر باندھ دیے اور نوجوانوں سے کہا:

"میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔ باقی باتیں باہر چل کر ہوں گی۔"

غار میں سے نکل کر یہ لوگ حاتم طائی کے ساتھ باہر آئے تو مرہٹہ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ حاتم نے کہا:

"کیا تم لوگ کوئی ایسی جگہ بتا سکتے ہو جہاں ہم رات کو چھپ سکیں؟"

ایک نوجوان بولا "اس جنگل میں، پہاڑی کے دامن میں، ایک کھوہ ہے۔ ہم وہاں جاکر چھپ سکتے ہیں۔ مگر پولیس وہاں بھی ہمیں تلاش کر سکتی ہے۔"

حاتم نے کہا "رات تو وہاں گزارتے ہیں، کل دیکھا جائے گا۔"

وہ نوجوان حاتم اور دوسرے نوجوانوں کو تین میل دور ایک کھوہ میں لے گیا۔ کھوہ کے منہ پر

گھنی جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ چاروں اُس کے اندر چھُپ گئے۔ حاتم نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُن میں کمال کوئی نہیں ہے۔ جب اس نے اُن سے کمال کے بارے میں پُوچھا تو ایک نوجوان نے کہا:

"کمال ہمارا ساتھی تھا۔ اُسے خطرناک جاسُوس سمجھ کر پولیس دِلّی کے لال قلعے میں لے گئی ہے۔"

حاتم طائی سوچ میں پڑ گیا۔ اِس کا مطلب تھا کہ اُسے وہاں سے واپس دِلی جانا پڑے گا۔ اب اُس نے اُن سے پُوچھا کہ وہ کون ہیں اور انھیں کِس لیے تکلیفیں دی جا رہی تھیں۔ ایک نوجوان نے جس کا قد لمبا اور بال گھنگھرالے تھے، کہا:

"پہلے یہ بتاؤ کہ تُم کون ہو جو رحمت کا فرشتہ بن کر ہمارے پاس آگئے ہ"

حاتم نے کہا "میرا نام حاتم طائی ہے' اور میں عرب سے آیا ہُوں" اِس کے بعد اُس نے لاہور جانے، وہاں ایک عورت سے ملنے اور پھر اُس کے بیٹے کمال کی تلاش میں بھارت آنے کا واقعہ سُنایا۔

گھنگھرالے بالوں والے نوجوان نے کہا "میرا نام

قطب ہے ۔ یہ دونوں میرے ساتھی ہیں ۔ میں ڈھاکے
میں پاکستان کی ہوائی کمپنی کا پائلٹ تھا ۔ جب وہاں
گڑ بڑ ہوئی تو میں اپنے ان دو ساتھیوں کو لے
کر ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے اُڑا ۔ میرا خیال تھا
کہ میں نیپال کی طرف نکل جاؤں گا اور پھر وہاں
سے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی پہنچ جاؤں گا ،
لیکن افسوس کہ راستے میں بھارتی ہوائی جہازوں نے
ہمیں اُترنے پر مجبور کر دیا ، اور پھر ہمیں جنگی قیدی
بنا کر اس غار میں بند کر دیا گیا ۔ وہ لوگ ہم
سے پاکستان کے فوجی راز پوچھنے کی کوشش کر
رہے تھے ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے اور ہماری
جان اِس عذاب سے بچ گئی ۔"

حاتم نے کہا " اب تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

دوسرا نوجوان ، جس کا نام کامران تھا ، بولا
" ہمیں کسی نہ کسی طرح سرحد عبور کر کے پاکستان
جانا ہے ۔"

قطب نے کہا " اگر مجھے کسی ہوائی اڈے پر
جیٹ طیارہ مل جائے تو میں تم سب کو پاکستان
لے جا سکتا ہوں ۔"

حاتم نے پُوچھا "بھارتی ہوا باز تمھارے طیّارے کو تباہ نہیں کر دیں گے ؟"

قُطب نے مُسکرا کر کہا "میں ایک ماہر ہوا باز ہُوں۔ میں طیّارے کو فضا میں اِتنی بلندی پر لے جاؤں گا کہ وہاں تک بھارتی طیّارے نہ پہنچ سکیں گے۔"

تیسرا نوجوان بولا "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرہٹہ سپاہی کے پستول سے نکلی ہوئی گولی تمھاری گردن پر لگی تھی۔ لیکن کیا وجہ کہ تُم زخمی نہیں ہُوئے ؟ تمھاری گردن سے ایک قطرہ خُون کا نہیں نِکلا ! کیا تُم کوئی جِنّ بھُوت ہو ؟"

حاتم ہنس کر کہنے لگا "میں جِن بھُوت نہیں ہُوں ، بلکہ تمھاری طرح ایک عام اِنسان ہُوں۔ ہاں میرے پاس ایک ایسا جادُو ہے جس سے میرے اندر ایک خاص قِسم کی طاقت آ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے اِس قِسم کی کُچھ اور باتیں تم دیکھو کہ جنھیں دیکھ کر تمھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے۔ خیر ، اس وقت اِن باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ جیٹ ہوائی جہاز ہم کس جگہ سے اِغوا کر سکتے ہیں ؟"

قطب نے کہا "یہاں سے جو ریل گاڑی بمبئی کو جاتی ہے، اس کے راستے میں ایک شہر پُونا آتا ہے۔ پُونا شہر میرا دیکھا بھالا ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا جنگی ہوائی اڈّا ہے۔ اس جگہ ہمیں کوئی جیٹ لڑاکا جہاز مل سکتا ہے۔ مگر وہاں پہرا بڑا سخت ہوتا ہے۔ جیٹ ہوائی جہاز اغوا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے"

دُوسرا نوجوان بولا "میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ہوائی جہاز اغوا کرنے کا منصُوبہ ترک کر دینا چاہیے کیوں کہ یہ ایک ناممکن اور اَن ہونی سی بات ہے"

حاتم طائی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "اگر اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہم جہاز اغوا کرنے میں ضرور کام یاب ہو جائیں گے۔ ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ اِس سِلسلے میں میرا جادُو بھی تمھاری مدد کرے گا"

دُوسرا نوجوان بولا "تُمھارا جادو جیٹ ہوائی جہاز کو ہینگر سے باہر لاکر ہَوا میں نہیں اُڑا سکتا۔ یہ کام قُطب کو ہی کرنا پڑے گا"

حاتم مُسکرایا " نوجوان ، تم میرے جادُو سے ابھی واقف نہیں ہو ۔ جب میرے جادُو کے کرشمے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے "۔

پھر اُس نے پائلٹ قُطب سے کہا " قُطب ، ہم پُونا جائیں گے اور جہاز اِغوا کریں گے ۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تُم مجھے دِلّی کیسے اُتارو گے ؟ میں دِلّی کے لال قلعے میں جا کر کمال کو آزاد کرانا چاہتا ہُوں "۔

قُطب بولا " ہم تمھیں پیرا شُوٹ کے ذریعے رات کو دِلّی سے باہر اُتار دیں گے ۔ کیا تم پیرا شُوٹ کے ذریعے چھلانگ لگا لو گے ؟"

" اگر پیرا شُوٹ کُھل گیا تو میں ضرُور چھلانگ لگا لُوں گا ۔ ویسے پیرا شُوٹ نہ بھی کُھلے تو بھی مُجھے کچُھ نہیں ہو گا "۔

حاتم طائی کی اس بات پر تینوں نوجوان حیرت سے اُسے تکنے لگے ۔ حاتم نے کہا " وقت آنے پر تمھیں سب کچُھ معلُوم ہو جائے گا ۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمیں پُونا کی طرف کس وقت کُوچ کرنا چاہیے ؟"

قُطب نے کہا " میرے ذہن میں ایک فسٹ کلاس

ترکیب آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم واپس غار میں جا کر مرہٹہ پولیس افسر اور سپاہیوں کی وردیاں پہن لیں گے۔ میں کپتان کی وردی میں ہوں گا، اور حاتم کو ہم اپنی حراست میں لے کر یہ ظاہر کریں گے کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے، اور ہم اسے پونا لے جا رہے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

حاتم نے کہا "بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ہمیں صبح ہونے سے پہلے پہلے اس خیال پر عمل کرنا ہوگا، کیوں کہ صبح ہونے کے بعد ہمارے جیل سے بھاگ جانے کی سب کو خبر ہو جائے گی اور ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔"

ہوا باز قطب بولا "میں ابھی غار میں واپس جا کر سپاہیوں اور کپتان کی وردی اُتار لاتا ہوں۔"

حاتم طائی نے دیکھا کہ قطب کے کندھے پر گرم سلاخ کا نشان ہے۔ باقی دونوں نوجوان ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہاں، انھیں بھوک نے ضرور پریشان کر رکھا تھا۔ حاتم نے قطب سے کہا:

"تمھارے کندھے کا زخم دُکھتا تو نہیں ؟ تمھاری جگہ میں یہ کام کرنے کو تیار ہُوں۔"

قُطب نے کہا "نہیں۔ میں یہ درد برداشت کر سکتا ہُوں۔ تمھارا یہاں رہنا ہی ٹھیک ہے۔ میں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

ہَوا باز قُطب، رات کے اندھیرے میں، کھوہ سے نکل کر غار کی طرف روانہ ہو گیا۔ حاتم نے دونوں نوجوانوں کو ایک ندی سے پتّوں میں پانی لا کر پلایا۔ وہاں زمین پر چند آم بھی گرے پڑے تھے۔ حاتم نے انھیں آم بھی لا کر دیے، جنھیں چُوس کر اُن کی جان میں جان آئی۔

ہوا باز قُطب کھوہ سے نکل کر غار میں آگیا جہاں پہرے دار اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ اُس نے اس کی وردی اُتاری۔ اندر مرہٹہ کپتان بھی اسی طرح رسّی میں جکڑا پڑا تھا۔ قُطب نے اس کی اور ایک سپاہی کی وردی اُتار کر ساتھ لی اور مرہٹے کپتان کو حیران پریشان چھوڑ کر واپس کھوہ کی طرف بھاگا۔

کھوہ میں اُس کا بڑی بے چینی سے اِنتظار

ہو رہا تھا۔ وہ کپتان کا پستول اور سپاہیوں کی دو مشین گنیں بھی لے آیا تھا۔ اُنھوں نے فوراً وردیاں پہنیں، حاتم کو ساتھ لیا اور کھوہ سے نکل کر گُل برگہ شہر کو جانے والی سڑک پر آکر کھڑے ہو گئے۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ستارے آسمان پر کانپ کانپ کر اِن چاروں کو دیکھ رہے تھے۔ اِتنے میں دُور سے ایک بس آتی نظر آئی۔ ہوا باز قُطب پولیس کپتان کی وردی میں تھا۔ وہ سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ بس ڈرائیور نے پولیس کے کپتان کو دیکھ کر بس روک لی۔ قُطب نے بڑی رُعب دار آواز میں کہا:

"ہمیں گُل برگہ لے چلو۔ ہم نے ایک پاکستانی جاسُوس پکڑا ہے۔ اِسے جلد تھانے پہنچانا ہے۔"

بس میں بیٹھی ہُوئی سواریوں نے چونک کر حاتم طائی کو دیکھا۔ ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر کہا "مہاراج، اندر آ جائیں۔"

چاروں بس میں سوار ہو گئے اور بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مُسافر حاتم طائی کو پاکستانی جاسُوس

سمجھ کر بڑی دِل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا:

"مہاراج، اِسے کہاں سے پکڑا ہے؟"

دُوسرا بولا "مہاراج، اِسے گولی مار دیں۔"

تیسری سواری نے کہا "کپتان صاحب، اِسے ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم خُود اِس سے نمٹ لیں گے۔"

اِس پر قُطب نے ڈانٹ کر کہا "بک بک بند کرو۔ یہ کام پولیس خُود کر لے گی۔"

ساری سواریاں سہم کر چُپ ہو گئیں۔ اِتنے میں بس شہر میں داخل ہو گئی۔ سارا شہر سویا ہوا تھا۔ کہیں کہیں مکانوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ قُطب نے بس کے ڈرائیور سے کہا:

"ہمیں ریلوے سٹیشن لے چلو۔"

بس ریلوے سٹیشن کے باہر رُک گئی۔ نقلی پولیس کپتان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ، حاتم کو حراست میں لیے ریلوے سٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اُس نے حاتم سے پُوچھا کہ اُس کے پاس ہندوستانی کرنسی ہو گی۔ حاتم نے جیب سے دو سو رُوپے نکال کر اُسے دے دیے۔ پائلٹ قُطب نے ان تینوں کو پلیٹ فارم پر بٹھایا اور خُود جا کر پُونا کے چار ٹکٹ خریدے۔ معلُوم

ہُوا کہ پُونا جانے والی گاڑی سات بجے روانہ ہو گی۔ ابھی سات بجنے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ قطب بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔ اِتنے میں پولیس کے دو سپاہی آئے اور قطُب کو سلُوٹ کرتے ہوئے گزر گئے۔

قطُب مُسکرا دیا۔ حاتِم طائی نے کہا :

" ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نِکل جانا چاہیے۔ دِن چڑھ گیا تو بھانڈا پھُوٹ جائے گا "

ایک نوجوان ، جس کا نام کامران تھا ، بولا " کم بخت گاڑی سات بجے سے پہلے نہیں چلے گی۔ اِس سے تو بہتر تھا کہ ہم کِسی بس میں سوار ہو کر پُونا چلے جاتے "

قطُب کہنے لگا " بس کا راستہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں اس علاقے سے واقِف ہُوں۔ اُس راستے میں جگہ جگہ پولیس کی چوکیاں ہیں۔ ریل گاڑی سب سے محفُوظ ہے۔ بس کسی طرح یہ تین گھنٹے خیریّت سے گزُر جانے چاہئیں "

خُدا خُدا کر کے سات بجے اور پُونا جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگی۔ یہ لوگ فورًا گاڑی میں سوار ہو گئے۔ پولیس کی وردیوں کی وجہ سے

کسی نے اُن پر شک نہیں کیا۔ ہاں، حاتم طائی کے عربی لباس کو ضرور لوگ غور سے دیکھتے تھے۔ ٹرین روانہ ہو گئی، اور سارا دن چلتی رہی۔ راستے میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ تیسرے پہر گاڑی پُونا کے بہت بڑے ریلوے سٹیشن پر جا کر رُک گئی۔

پائیلٹ قطب اپنے ساتھیوں کو لے کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اُس کا پروگرام یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کو کسی محفوظ جگہ بٹھا کر خود ایئرپورٹ جائے اور یہ جائزہ لے کہ جیٹ طیّارے کہاں کھڑے ہیں، اور وہ طیّارے کو کس طرح اِغوا کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر، سٹیشن کے پاس، ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گیا۔ یہاں اُس نے ایک کمرا کرائے پر لیا اور حاتم اور دُوسرے ساتھیوں کو اپنی سکیم سمجھائی:

"میں چاہتا ہُوں کہ آج رات کسی وقت ہم طیّارہ اغوا کر کے یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

حاتم نے کہا "اس سلسلے میں تمھیں میری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

پائیلٹ نے کہا "تم شاید میری مدد نہ کر سکو بلکہ ہو سکتا ہے میرے لیے کوئی پریشانی پیدا کر دو۔ اِس لیے میرا خیال ہے کہ تم ہوٹل میں ہی ٹھہرو۔"

حاتِم نے مُسکرا کر کہا "یہ وہاں جا کر تمھیں معلوم ہو گا کہ میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

قُطب نے اپنے ساتھیوں کو ہوٹل میں ٹھہرنے کی تاکید کی اور حاتم طائی کے ساتھ فوجی ہوائی اڈّے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ پُونا میں رہ چُکا تھا اور اِس علاقے سے خُوب واقِف تھا۔ پولیس کپتان کی وردی بھی اُس کی مدد کر رہی تھی۔ کوئی اُسے نہیں روک سکتا تھا۔

بس میں سوار ہو کر وہ فوجی ہوائی اڈّے پہنچ گئے۔ یہاں فوج کا سخت پہرا تھا۔ قُطب نے حاتم سے کہا:

"طیّاروں کے ہینگر دُوسری طرف ہیں۔ ہمیں اس طرف سے ہوائی اڈّے میں داخل ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ حاتِم کو لے کر ہوائی اڈّے کے پیچھے کھیتوں

میں چلا گیا۔ یہاں سے رن وے نظر آ رہا تھا۔ رن وے کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے دونوں ایک ہینگر کے قریب گئے تو ایک فوجی نے انھیں روک کر پُوچھا کہ وہ اِدھر کیا کر رہے ہیں۔ قُطب نے جواب دیا:

"میرا نام شیو کمار ہے۔ میں پولیس اِنسپکٹر ہُوں، اور یہ پاکستانی جاسُوس ہے۔ میں یہاں تفتیش کرنے آیا ہُوں۔"

سپاہی نے کہا "شناختی کارڈ دِکھائیے۔"

یہ سوال بم کا گولا بن کر قُطب پر گِرا کیوں کہ شناختی کارڈ دِکھانے سے سارا بھانڈا پھُوٹ جاتا۔ کارڈ اُس کی جیب میں تھا، مگر اُس پر دُوسرے شخص کی تصویر تھی۔ حاتم بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ اب فوجی نے ذرا رُعب سے کہا:

"شناختی کارڈ دِکھائیے!"

قُطب یُوں ہی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اِس پر حاتم نے مُسکرا کر سپاہی کو دیکھا اور کہا "تیری زندگی کے دِن پُورے ہو گئے ہیں۔"

سپاہی نے مشین گن کا مُنھ حاتم طائی کی طرف

کر دیا اور بولا " یہ کیا بکواس ہے ؟ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو !"

اِس عرصے میں حاتم اسم پڑھ چکا تھا۔ اُس نے سپاہی کی طرف اِشارہ کر کے کہا " غائب ہو جا !"

سپاہی کھڑا کھڑا غائب ہو گیا۔ قُطب ہکّا بکّا حاتم طائی کا مُنھ تک رہا تھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیسے ہو گیا ؟ ایک اِنسان کھڑے کھڑے ایک دم کیسے غائب ہو گیا ؟

حاتم نے کہا " میں نے کہا تھا نا کہ تمھیں میری ضرورت پڑے گی۔ اب چلو۔ ہینگر تک تو میں نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

پائلٹ قطب آگے بڑھا۔ شام کا اندھیرا رات میں تبدیل ہو چکا تھا اور رن وے کے دونوں جانب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ مگر جدھر ہینگر تھا وہاں صرف ایک بلب کی پھیکی سی روشنی تھی۔ وہ دونوں چھپتے چھپاتے ہینگر کے اندر چلے گئے۔ یہاں ایک میراج جیٹ طیّارہ کھڑا تھا۔ پائیلٹ قُطب نے سب سے پہلے اُس کی پٹرول کی ٹنکی دیکھی۔ وہ بھری ہُوئی تھی، اور طیّارے کے ساتھ فالتو پٹرول

کی ٹنکیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ طیّارہ کسی خاص پرواز کے لیے تیّار کیا گیا تھا۔

قُطب نے حاتم سے کہا "تم اسی جگہ ٹھہرو۔ ہر کام ٹھیک ہے۔ میں جا کر اپنے ساتھیوں کو لاتا ہُوں۔ ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں تمھارا اِنتظار کروں گا" حاتم بولا۔

قُطب نے ہینگر کے پاس ملٹری پولیس کے کسی سپاہی کی ایک موٹر سائیکل کھڑی دیکھی۔ خوش قِسمتی سے اس میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور حاتم کو بٹھا کر، ہوا سے باتیں کرتا ہوا سیدھا ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور ہوائی اڈّے کے پیچھے رن وے پر، ہینگر کے قریب، آکر رُک گیا۔

"جلدی! ہینگر کے اندر چلو" اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

حاتم میراج جیٹ طیّارے کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے زمانے میں اُڑن کھٹولوں کا ذکر

تو سُنا تھا کہ ہوا میں اُڑا کرتے ہیں مگر اُڑن کھٹولا دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اب ایک خُوب صُورت اور دیو جیسا جیٹ اُڑن کھٹولا اُس کے سامنے تھا اور حاتم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر وزنی طیّارہ ہوا میں کس طرح اُڑے گا!

اِتنے میں قُطب نے آ کر کہا "سب کام ٹھیک ہے۔"

چاروں طیّارے میں داخل ہو گئے۔ طیّارے کا اندرونی حِصّہ دیکھ کر حاتم طائی اور حیران ہوا۔ اُس کے اندر تین پیراشُوٹ پڑے تھے۔ کامران نے قُطب سے پُوچھا کہ وہ ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور کی مدد کے بغیر طیّارہ کیوں کر اُڑائے گا۔ قُطب جہاز کی مشین چیک کر رہا تھا۔ وہ کامران کی طرف دیکھ کر بولا:

"میں ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنا جانتا ہُوں۔ میں پاکستانی ہوا باز ہُوں۔ آسمانوں کا شاہین ہُوں۔ میں نے جیٹ کو ایک بار زمین کی سطح سے اُوپر اُٹھا لیا تو پھر اِس مُلک کی ساری ہوائی فوج مِل کر بھی مجھے نہیں پکڑ سکے گی۔ کنٹرول ٹاور کی بھی

مجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اِن فضاؤں میں جہاز اُڑاتا رہا ہوں۔"

قطب نے طیارے سے باہر نکل کر ہینگر کی آہنی دیوار میں ایک جگہ طاق کھول کر بٹن دبایا تو ہینگر کا بڑا دروازہ بغیر کسی شور کے اُوپر اُٹھنا شروع ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے طیارے میں پائلٹ کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ حاتم طائی اور اس کے ساتھی پیچھے والی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہینگر کا دروازہ پُورا اُوپر اُٹھ گیا تو قطب نے کہا:

"بس، اب آپ لوگ خُدا سے دُعا کریں کہ جب تک طیارہ رن وے سے بلند نہ ہو جائے، سکورٹی گارڈ کو خبر نہ ہو۔ اگر اس وقت انھیں پتا چل گیا کہ ہم طیارہ اغوا کر کے لے جا رہے ہیں تو وہ راکٹ مار کر طیارہ تباہ کر دیں گے۔"

حاتم طائی نے کہا "خُدا ہماری مدد کرے گا۔ تم اللہ کا نام لے کر جہاز کو چلاؤ۔"

قطب نے کانوں کو ہاتھ لگائے، کلمہ شریف پڑھا اور انجن کا بٹن دبا دیا۔ صرف ایک چھوٹا سا انجن ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سٹارٹ ہوا۔ قطب

نے بریک کھول دیے اور جہاز کو ہینگر سے باہر نکال کر رن وے پر لے آیا۔ اسی وقت کنٹرول ٹاور کو خبر ہو گئی اور طیّارے کے وائرلیس سیٹ پر کنٹرول ٹاور والے کی آواز بلند ہوئی :

"ہیلو ! ہیلو ! راجر ! تمھاری فلائٹ شیڈول نہیں ہے۔ جواب دو !"

قُطب کی چمکیلی تیز آنکھیں سامنے رن وے پر لگی تھیں اور وہ جہاز کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھا رہا تھا، کیوں کہ اسے، آگے جا کر، جہاز کا رُخ رن وے نمبر چار پر لا کر شمال مغرب کی طرف دِلّی اور پھر لاہور کی طرف پرواز کرنی تھی۔

وائرلیس پر کنٹرول ٹاور بار بار پُوچھ رہا تھا :

"ہیلو ! راجر ! جواب کیوں نہیں دیتے ؟ ہیلو ! راجر ! جواب نہ دیا تو جہاز تباہ کر دیا جائے گا اُوَر !"

یہ بڑا خطرناک وقت تھا۔ قُطب نے مائیک آن کر کے کہا :

"ہیلو ! چارلی ! میں پی کے بیس 25 بول رہا ہوں۔ یہ روز کی ٹیسٹ پرواز ہے۔ اُوَر !"

"ٹیسٹ پرواز آدھی رات کو کیوں ؟ جواب دو
اُوور !"

"یہ سپیشل ٹیسٹ پرواز ہے۔ پی کے 20۔ اُوور۔"

ایک ماہر ہوا باز ہونے اور پونا کے علاقے سے واقف ہونے کی وجہ سے پائیلٹ قطب یہاں کی آزمائشی پرواز کے مخفیہ لفظ اور اوقات جانتا تھا۔ گھپلا صرف یہ تھا کہ کنٹرول ٹاور پر اس کی آدھی رات کی پرواز درج نہیں تھی۔ اب قطب کا مقصد صرف اتنا تھا کہ جہاز کے اُوپر اُٹھنے تک کسی طرح کنٹرول والوں کو باتوں میں لگائے رکھے۔

قطب اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ کنٹرول پر کوئی نیا نیا سگنلر بیٹھا تھا۔ وہ باتوں میں اُلجھ چکا تھا اور قطب کا میراج جیٹ رن وے پر اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے اُسے ٹیک آف کرنے کے لیے اپنے انجنوں کو فل سپیڈ پر سٹارٹ کرنا تھا۔ حاتم طائی اور دُوسرے ساتھی سانس روکے یہ سارا ڈراما دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز رن وے کی صحیح پوزیشن میں آیا تو کنٹرول ٹاور کی آواز سُنائی دی :

"راجر! راجر! ٹیک آف نہ کرنا۔ تمھیں اِجازت نہیں ہے۔ اُوور۔"

"تم جاؤ جہنّم میں۔ میں جا رہا ہُوں، چارلی۔"

اِتنا کہ کر پائیلٹ قُطب نے جہاز کے انجن سٹارٹ کر کے اُسے پُوری سپیڈ پر چھوڑ دیا۔ پہاڑ ایسا میراج جیٹ طیّارہ گرجتا دھاڑتا رن وے پر طوفانی سپیڈ کے ساتھ دوڑنے لگا اور پھر چند سیکنڈ بعد اُس نے زمین چھوڑ دی اور ایک ہیبت ناک دہاڑ کے ساتھ فضا میں بلند ہو گیا۔

پاکستانی پائیلٹ قُطب کی یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ لیکن اصل میں اب اس کی جنگ شروع ہوئی تھی۔ کنٹرول پر یہ راز کھُل گیا تھا کہ جیٹ طیّارہ اِغوا کر لیا گیا ہے۔ ایئرپورٹ پر خطرے کا الارم بجا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دو ہوا باز اپنے اپنے لڑاکا طیّاروں کی طرف دوڑے۔ لیکن اس دوران میں ان کا جیٹ طیّارہ اُڑتے ہوئے کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔

قُطب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ پیراشُوٹ باندھ لیں، کیوں کہ خُدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا تو وہ

ہلاک ہونے سے بچ جائیں گے ۔ حاتم طائی کی کمر پر بھی پیراشوٹ باندھ دیا گیا ۔ اب پاکستانی پائیلٹ کی مہارت کا امتحان تھا ۔ اس نے طیّارے کو اُوپر اُٹھانا شروع کیا اور چند سیکنڈ بعد وہ چوبیس ہزار فٹ سے بلند ہوکر چونتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا۔

یہاں انھوں نے اپنے اپنے آکسیجن ماسک پہن لیے جو طیّارے میں رکھے ہوتے ہیں ، کیوں کہ اِتنی بلندی پر جا کر ہوا میں آکسیجن بہت کم رہ جاتی ہے ۔ جہاز میں ہوا کا دباؤ بھی بڑھا دیا گیا۔

اچانک ایک جیٹ طیّارہ ان کے پیچھے سے گزر گیا ۔ قُطب نے چلّا کر کہا "وہ لوگ آ گئے ہیں ، لیکن فکر نہ کرو ۔ اُن کا باپ بھی اتنی بلندی پر آنے کی ہمّت نہیں کر سکتا ۔ میں نے جان کی بازی لگا رکھی ہے ۔"

اور ایسا ہی ہُوا ۔ بھارتی لڑاکا جہازوں نے نیچے ہی نیچے کچھ دُور تک میراج طیّارے کا پیچھا کیا ، لیکن پھر تھک ہار کر واپس چلے گئے ۔ لیکن انھوں نے ناگ پُور کے ایئرپورٹ کو اِطّلاع

کر دی کہ بھارت کا ایک میراج طیّارہ اغوا کر کے
لے جایا جا رہا ہے۔

ناگ پُور کی فضا میں چار لڑاکا طیّارے بلند ہُوئے، مگر وہ بھی حاتم طائی کے جیٹ طیّارے کی بلندی تک نہ پہنچ سکے اور دِلّی ایئرپورٹ کو اطلاع دے کر واپس چلے گئے۔

یہ چکّر دِلّی تک چلتا رہا۔ آخر آدھی رات کے وقت میراج طیّارہ دِلّی کی فضاؤں میں پہنچ گیا۔ قُطب نے حاتم طائی سے کہا :

"دوست دِلّی ہمارے نیچے ہے۔ کیا تم واقعی یہاں اُترنا چاہتے ہو یا ہمارے ساتھ پاکستان جانا چاہتے ہو؟"

حاتم طائی نے کہا "میں اسی جگہ اُتروں گا، اور اُس دُکھی عورت سے کیا گیا وعدہ پُورا کروں گا۔ میں اس کے بدنصیب بیٹے کمال کو ساتھ لے کر واپس آؤں گا۔ مجھے یہاں اُتار دو۔"

قُطب جہاز کو بہت زیادہ بلندی پر اُڑا رہا تھا، اور اتنی اُونچائی سے پیراشُوٹ کے ذریعے کُودنا بے حد خطرناک تھا۔ پیراشُوٹ سے چھلانگ

لگانے کے لیے اُسے نیچے دس ہزار فٹ تک کی بلندی پر آنا تھا۔ اُدھر جہاز پر حملے کا خطرہ برابر موجود تھا، کیوں کہ دلّی ائرپورٹ والے خبردار ہو چکے تھے۔ مگر حاتم طائی کا اُترنا بھی ضروری تھا۔ پاکستانی پائلٹ نے یہ خطرہ بھی مول لے لیا، اور حاتم طائی کو چوکس رہنے کے لیے کہ کر جہاز کو ایک دم غوطہ دیا۔ جہاز چونتیس ہزار سے ایک دم دس ہزار کی بلندی پر آگیا۔ قطب نے کامران کو اشارہ کیا اور سبز بتّی جلا دی۔ کامران نے کاک پٹ کی چھت کھول کر حاتم سے کہا:

"کُود جاؤ!"

پہلے تو حاتم ڈرا۔ زندگی میں پہلی بار وہ زمین کو اتنی اُونچائی سے دیکھ رہا تھا اور اُسے چکّر آ رہے تھے۔ لیکن چُوں کہ وہ شروع ہی سے خطرہ مول لینے کا عادی تھا اور بڑی بڑی مُصیبتوں اور آزمائشوں سے گزر چُکا تھا اِس لیے اس نئے خطرے کے لیے بھی فورًا تیّار ہو گیا۔ اُس نے اللہ کا نام لے کر جہاز کے کاک پٹ میں سے چھلانگ لگا دی۔ اُس کے چھلانگ لگاتے ہی جیٹ طیّارہ ایک

غوطہ کھا کر اندھیرے آسمان میں غائب ہو گیا۔ وہ پھر چونتیس 34 ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ دلّی کی اندھیری فضاؤں میں بھارتی ہوائی فوج کے چار لڑاکا طیّارے گرجتے پھر رہے تھے۔ انھوں نے میراج طیّارے پر راکٹ بھی فائر کیے، مگر قُطب کا طیّارہ ان کی پہنچ سے بہُت دُور نکل گیا تھا۔

حاتِم طائی کے پیرا شوٗٹ کا رنگ کالا تھا جو اندھیری رات میں بھارتی ہَوا بازوں کو دِکھائی نہیں دیا۔ ورنہ ایک دو راکٹ حاتِم طائی پر بھی فائر ہو جاتے۔

حاتِم طائی کا پیرا شوٗٹ کھُل گیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا!

شہزادہ سوتا جاگتا

دِلّی میں آدھی رات تھی۔ پھر بھی شہر روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا۔

حاتِم طائی کا پیرا شوٗٹ ایک سُنسان ویرانے

میں درختوں کے درمیان اُتر گیا۔ اُسے پائلٹ قُطب نے بتا دیا تھا کہ اسے نیچے اُتر کر کیا کرنا ہے۔ چُناں چہ اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ پیراشوٹ کو اپنے جسم سے الگ کر کے تہہ کیا اور ایک جگہ جھاڑیوں میں چھُپا دیا۔ اِس کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا۔ قُطب نے اُسے اندازے سے اس جگہ گرایا تھا جہاں سے قلعہ قریب ہی تھا۔

حاتم پہلی بار دِلّی آیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کِس طرف جائے۔ قلعے کی طرف جانے کے لیے اُسے صُبح کی روشنی کا اِنتظار تھا، کیوں کہ دِن کی روشنی میں ہی اُسے قلعہ نظر آ سکتا تھا۔ مگر حاتِم کا یہ خیال غَلَط ثابت ہوا کہ پُرانے زمانے کے شہروں کی طرح دِلّی کا قلعہ بھی دُور ہی سے نظر آ جائے گا۔ ساری رات وہ جنگل میں پڑا رہا اور جب دن نِکلا تو سڑک پر چلنے لگا۔ اُس کے سامنے کارخانوں کی چمنیاں اور اُونچی اُونچی عمارتیں تھیں، لیکن قلعہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

لوگ کارخانوں کی طرف جا رہے تھے۔ بسیں، رکشے ٹرام کاریں مسافروں سے لدی پھندی آ جا رہی تھیں۔

دِلّی تو ایک بھگدڑ کا شہر تھا۔ چاروں طرف اِنسان ہی اِنسان دکھائی دے رہے تھے۔ ہر کوئی پاگلوں کی طرح بھاگا جا رہا تھا۔ حاتِم نے ایک آدمی سے پُوچھا کہ دِلّی کا قلعہ کِدھر ہے تو اُس نے ایک طرف اِشارہ کر کے کہا "لال قلعہ" اور ہجُوم میں غائب ہو گیا۔

حاتِم طائی کو معلُوم ہوا کہ دِلّی کے قلعے کو لال قلعہ کہتے ہیں۔ وہ چاندنی چوک میں آ گیا۔ یہاں اُس نے ایک حمّام میں جا کر غسل کیا اور کپڑے دھو کر استری کروائے۔ اِس کے بعد بال ترشوائے اور ڈاڑھی کا خط بنوایا۔ اب وہ پھر سے اِنسان کی جُون میں آ گیا تھا۔

اب وہ دِلّی کی جامع مسجد کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مسجد کی سیڑھیوں پر لوگ طرح طرح کی چیزیں بیچ رہے تھے۔ کہیں پانی پلانے والوں کے کٹورے بج رہے تھے۔ کہیں نہاری کھائی جا رہی تھی۔ کہیں فالُودہ بِک رہا تھا تو کہیں گرما گرم چائے اور ٹھنڈی لسّی سے لوگ دل بہلا رہے تھے۔

لال قلعے کی سُرخ پُرجلال اور اُونچی فصیل پائیں

جانب ، میدان کے پار ، دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اُسی طرف روانہ ہو گیا۔ قلعے کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور وہ ٹکٹ لے کر اندر جا رہے تھے۔ قلعے کے ایک حصّے میں فوج کے خُفیہ محکمے کے تہہ خانے تھے ، جہاں خطرناک جاسُوسوں کو بند کر کے اُن سے پُوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ حاتم کو قلعے کے اِسی خُفیہ حِصّے میں جانا تھا ، اور یہ کام وہ اندر جاکر ہی کر سکتا تھا۔

اُس نے ٹکٹ لیا اور قلعے کے دروازے میں داخِل ہو گیا۔ ایک بازار اندر تک چلا گیا تھا ، جس کے دونوں جانب دکانیں تھیں اور ان میں قِسم قِسم کی تاریخی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ آگے جاکر قلعے کا پہلا تختہ آ گیا۔ یہاں سے دوسرے تختے تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ یہاں ایک خُوب صُورت سی مسجد ہے ، جسے موتی مسجد کہتے ہیں۔ موتی مسجد سبز کُنج میں شبنم کے سفید پاکیزہ قطرے کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی بچیّوں نے آم کے پیڑوں میں جھُولے ڈال رکھے تھے اور گیت گا رہی تھیں۔

قلعے کے بڑے ہال میں 1857ء کی جنگِ آزادی

کے زمانے کی تصویریں، تلواریں، بندوقیں اور توپیں نمائش کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ حاتم نے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ قلعے کے نیچے جو قید خانے ہیں، ان کا کھوج کیسے لگائے۔

وہ اسی فکر میں تھا کہ ایک بوڑھا مسلمان مالی اُسے مل گیا، جو گلاب کے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا۔ حاتم نے اُسے سلام کیا اور اپنا تعارف ایک عرب مسلمان کی حیثیت سے کرایا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس سے پوچھا کہ یہاں قلعے کے نیچے کوئی قید خانہ بھی ہے۔ بوڑھے مالی نے بتایا کہ "ہاں، ایک قید خانہ ہے جو فوج والوں نے بنا رکھا ہے اور جہاں خطرناک جاسوس رکھے جاتے ہیں۔ اس کا دروازہ شاہی حماموں کے پیچھے ہے، مگر وہاں بڑا سخت پہرا ہے۔ کوئی چڑیا بھی وہاں پر نہیں مار سکتی۔"

حاتم نے کہا "بابا، چڑیا پر نہیں مار سکتی لیکن انسان چاہے تو پر مار سکتا ہے۔"

بوڑھا مالی ہنسنے لگا، اور حاتم طائی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد شاہی حماموں والے حصے

ہیں آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ دُوسرے تختے کی چھ سات سیڑھیاں اُتر کر سامنے دیوار میں ایک دروازہ ہے جس میں سے ایک راستہ نیچے قید خانے کو جاتا تھا۔

قید خانے کے دروازے پر بھارتی ملٹری پولیس کا ایک سپاہی پہرا دے رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مُونچھیں تھیں اور چہرہ پتّھر کا سا لگتا تھا۔ حاتم دِل ہی دل میں مُسکرایا اور اپنے آپ سے کہنے لگا کہ اس کو پتّھر بنانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ تو پہلے ہی آدھا پتّھر کا ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ رات کے وقت اندر داخل ہو گا۔

سارا دن اُس نے قلعے کی سیر کرتے گزُارا اور شام کو قلعے کے بازار میں ایک رستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اب پبلک کے لیے لال قلعے کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ حاتم قلعے کے اندر ایک جگہ چھُپ کر بیٹھ گیا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ چاروں طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ حاتم شاہی حمّاموں کے قریب ایک محل نما کھنڈر کے دیوانِ خاص میں، ستوُن کے پاس،

سنگِ مرمر کے بنچ کے پیچھے چھُپا بیٹھا تھا۔ سامنے گھاس کا ایک بڑا سا تختہ تھا، جہاں انار اور مول سری کے درخت، رات کے اندھیرے میں، خاموش کھڑے تھے۔ ہر طرف قبرستان ایسی خاموشی تھی۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ حاتم نے سوچا کہ اب تہہ خانے میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وہ اُٹھا ہی تھا کہ اچانک ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی عورت جھانجھر چھنکاتی چلی آ رہی ہے۔ حاتم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی عورت دِکھائی نہ دی۔ مگر جھانجھر کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

حاتم ستون کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جھانجھروں کی آواز کس کی ہے۔ سارا قلعہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ستاروں کی دُھندلی سی روشنی میں صرف درخت اور جھاڑیاں دِکھائی دے رہی تھیں۔ اِتنے میں حاتم طائی کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوبصورت شہزادی، زرق برق لباس پہنے، جھانجھر چھنکاتی، آئی اور مولسری کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر انار کے درخت کی طرف دیکھ کر بولی:

"اِس قلعے کا شہزادہ سوتا ہے کہ جاگتا ہے؟"

اِس سوال کو شہزادی نے تین بار دُہرایا ۔ تیسری بار انار کا درخت جھُومنے لگا ۔ پھر درخت اچانک غائب ہوگیا اور اس کی جگہ سُنہری تاج پہنے ایک خُوش شکل شہزادہ ظاہر ہوا ۔

شہزادی نے آگے بڑھ کر شہزادے کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی :

" سرتاج شہزادے ! تم کب تک لال قلعے کی چُڑیل کے قبضے میں رہو گے ؟ میں کب تک پرستان سے یہاں آتی رہوں گی ؟ تُم کب میرے ساتھ چلو گے ؟ "

شہزادے نے آسمان کی طرف مُنھ اُٹھا کر کہا " شہزادی ، جب تک خُدا کی مرضی نہیں ہوگی ، میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکوں گا ۔ میرے پاؤں انار کے درخت کی طرح زمین کے اندر دفن ہیں ۔ میں تو اپنی جگہ سے ایک اِنچ بھی نہیں ہل سکتا ۔ "

حاتم نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو شہزادے کے پاؤں ٹخنوں تک زمین کے اندر دھنسے ہوئے نظر آئے ۔ شہزادی اور شہزادہ کچھ دیر دُکھی آواز میں باتیں کرتے رہے ۔ شہزادی رو رہی تھی ۔ اُس کا شہزادہ کسی

چڑیل کے قبضے میں تھا اور اس کے ساتھ پرستان نہیں جا سکتا تھا۔ اتنے میں ایک بھیانک قہقہے کی آواز آئی۔ شہزادہ اور شہزادی کانپ کر ایک دوسرے سے لگ گئے۔ مولسری کا درخت لرزنے لگا۔

پھر اچانک درخت کے پیچھے سے ایک خوف ناک چڑیل نمودار ہوئی۔ اس کے بازو لمبے لمبے تھے، پیر اُلٹے تھے، سر کے بالوں کا چھتّا سا بنا ہوا تھا اور دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ سب سے بھیانک بات یہ تھی کہ اس کے گلے میں دو ناگ پھن اُٹھائے پھنکاریں مار رہے تھے۔ چڑیل کے ایک ہاتھ میں لوہے کا لٹھ تھا اور دُوسرے ہاتھ میں اُس نے سانپ پکڑ رکھا تھا جو سر اُٹھائے شہزادی کو گھُور رہا تھا۔

چڑیل نے سانپ والا ہاتھ بلند کر کے کہا "تمھارا وقت ختم ہوا۔ اب پھر درخت بن جاؤ!"

اور شہزادہ دوبارہ انار کے درخت میں تبدیل ہوگیا۔ چڑیل نے قہقہہ لگایا اور شہزادی کی طرف سانپ والا ہاتھ بڑھایا۔ شہزادی پیچھے ہٹ کر مولسری کے درخت سے لگ گئی۔ چڑیل قہقہے لگاتی غائب ہو گئی۔

شہزادی کچھ دیر وہاں اُداس کھڑی آنسو بہاتی رہی، پھر وہ بھی سر جھکائے ایک طرف کو چل پڑی۔ اس کے پاؤں کی جھانجریں ہولے ہولے چھنک رہی تھیں۔

حاتم طائی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادی کی مدد کرے گا، اور اُسے سانپوں والی چڑیل کے منحوس پنجے سے نجات دلائے گا۔ وہ ستونوں کے پیچھے سے نکل کر شہزادی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شہزادی نے اُسے دیکھا تو گم صم کھڑی ہو گئی۔ حاتم طائی نے کہا:

"بہن، گھبراؤ نہیں۔ اگر تم پرستان کی رہنے والی ہو اور میری آواز سن سکتی ہو تو سنو۔ میرا نام حاتم طائی ہے اور میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

شہزادی کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے مسکراہٹ آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اُس نے آنسو بھری آنکھیں اُٹھا کر کہا:

"تم میری خاطر اپنی جان کیوں گنواتے ہو۔ میری تو قسمت میں یہی لکھا تھا۔ تم واپس چلے جاؤ اور مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔"

حاتم طائی نے کہا "نہیں، شہزادی۔ میں تمھیں اور شہزادے کو چڑیل سے رہائی دلا کر ہی رہوں گا

مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور اِس چُڑیل کے پھندے میں کیسے پھنس گئے؟"

شہزادی نے کہا "اے حاتم، میں پرستان کی رہنے والی ہُوں اور میرا نام نیلم پری ہے۔ یہ شہزادہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے اس محل میں رہتا تھا۔ ایک روز میں اس کے محل کے اُوپر سے گُزر رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ میں نیچے اُتر کر اس کے پاس آئی اور پھر ہم نے شادی کر لی اور ہنسی خوشی اس محل میں زندگی بسر کرنے لگے۔

"مگر ہماری خُوشیاں اس چُڑیل کو نہ بھائیں۔ یہ چُڑیل لال قلعے میں رہتی تھی اور کئی اِنسانوں کو کھا چُکی تھی۔ اس نے شہزادے کو کھایا تو نہیں، مگر انار کا درخت بنا کر یہاں کھڑا کر دیا۔ اب ہر روز جب آدھی رات گُزر جاتی ہے تو میں پرستان سے شہزادے کے پاس آتی ہُوں اور تھوڑی دیر بیٹھ کر آنسو بہا کر واپس چلی جاتی ہُوں۔ میں چُڑیل کی کی منّت سماجت کر کر کے تھک گئی ہُوں۔ وہ کسی قیمت پر شہزادے کو رہا کرنا نہیں چاہتی۔ شاید اُسے ہماری مُصیبت سے خوشی ہوتی ہے۔ اگر تُم نے چُڑیل کا

مقابلہ کیا تو وہ تمھیں زندہ نہ چھوڑے گی۔ اِس لیے میرا کہا مانو اور اُلٹے پاؤں یہاں سے چلے جاؤ۔"

حاتم طائی نے کہا "نیلم پری، حاتم طائی کسی مُصیبت زدہ کی مدد کیے بغیر کبھی واپس نہیں گیا۔ میں تمھیں اس مُصیبت سے نکالوں گا اور کل رات چڑیل آئے گی تو میں اس سے جنگ کروں گا۔"

پرستان کی شہزادی حاتم طائی کا مُنھ تکنے لگی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حاتم اس خون خوار چڑیل کا مقابلہ کر سکے گا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی۔ اس کے جھانجروں کی آوازیں دھیرے دھیرے دُور ہوتی گئیں اور پھر وہ ایک دم درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ حاتم طائی انار کے درخت کے پاس آ گیا اور درخت پر ہاتھ پھیر کر بولا:

"شہزادے، گھبراؤ نہیں۔ تم بہت جلد آزاد ہو جاؤ گے۔ تمھاری مُصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔"

لال قلعے کی چُڑیل

اُس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ لال قلعے

میں قبرستان ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دُوسرے تختے
پر، جہاں زمین دوز قید خانے کا دروازہ تھا، ایک
بلب روشن تھا اور ایک فوجی پہرا دے رہا تھا۔ حاتم
کو اسی دروازے میں سے گزر کر اندر جانا تھا۔ اُس
نے سوچا کہ ابھی نیچے جانے کی کوشش کروں یا
کل رات کو جاؤں۔ لیکن کل رات کو اُسے لال قلعے
کی خوف ناک چڑیل کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس لیے اُس
نے سوچا کہ اُسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

وہ آہستہ آہستہ نیچے والے تختے کی طرف چلا،
اور پہلے تختے کی سُرخ پتھریلی سیڑھیاں اُتر کر دُوسرے
تختے پر چلتا ہوا تہہ خانے والے دروازے کے
پیچھے آ گیا۔ اب اِحتیاط کی ضرورت تھی، کیوں کہ
وہ خطرے کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی ذرا سی
غلطی اُسے مُصیبت میں پھنسا سکتی تھی۔ فوج یا
پولیس کے سپاہی حاتم کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچا
سکتے تھے، مگر ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ کمال کو یا تو
ہلاک کر دیں یا اسے کِسی ایسی جگہ لے جا کر بند کر
دیں کہ حاتم ساری زندگی بھی تلاش کرتا رہے تو
اُسے نہ پا سکے۔

قلعے کی مشرقی جانب ، آم کے گھنے درختوں میں، ایک اُلّو تھوڑی دیر بول کر خاموش ہو گیا ۔ اُس کی ڈراؤنی آواز نے رات کے اندھیرے کو اور زیادہ ڈراؤنا بنا دیا ۔حاتم نے سوچا کہ ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ تہہ خانے میں اس طرح پہنچ جائے کہ کسی کو خبر نہ ہو اور اگر خبر ہو بھی تو کمال کو کوئی نقصان نہ پہنچے ۔

آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ اُسے خُود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دینا چاہیے ۔ سپاہی اُسے قید خانے میں لے جا کر قید کر دیں گے اور وہاں وہ دُوسرے قیدیوں سے کمال کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے گا ۔

وہ تہہ خانے کے سامنے والے دروازے پر آیا ہی تھا کہ فوجی سپاہی نے گرج دار آواز میں کہا" ہالٹ ! کون ہو تُم ؟"

حاتم نے گھبرانے کی اداکاری شروع کر دی ۔ وہ اِتنی اچھّی اداکاری کر رہا تھا کہ اگر کوئی فلم ڈائریکٹر اُسے دیکھ رہا ہوتا تو اپنی فلم میں ضرُور چانس دے دیتا ۔ اس کی اداکاری کا فوجی پر وہی اثر ہوا جو وہ

چاہتا تھا۔ سپاہی نے حاتم کو جاسوس سمجھ کر تہہ خانے میں لے جاکر بند کر دیا۔

حاتم کا خیال تھا کہ کوٹھڑی میں دوسرا کوئی قیدی بھی ہوگا، جس سے وہ کمال کے بارے میں پوچھ سکے گا۔ مگر ساری کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ اب کیا کرے؟ وہ سلاخوں کے پاس کھڑا ہو گیا اور، راہ داری میں، دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ شاید کوئی قیدی نظر آ جائے۔

برابر والی کوٹھڑی میں ایک ادھیڑ عمر کا مسلمان تہجّد کی نماز پڑھ رہا تھا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حاتم نے اُسے سلام کیا جس کا جواب دے کر اس بزرگ نے پوچھا:

"میاں، تم یہاں کیسے آ گئے؟ کیا تم بھی پاکستانی جاسوس ہو؟"

حاتم طائی نے کہا "محترم، میری کہانی بڑی لمبی ہے۔ میں اس وقت آپ سے ایک ضروری بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

بزرگ نے کہا "ضرور پوچھو۔ میں تمھاری کوئی مدد کر سکا تو مجھے خوشی ہوگی۔ ویسے اُمید نہیں کہ

اِس جہنّم میں میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔"
حاتم نے کہا "کیا آپ کو یہ علم ہے کہ کمال نام کا ایک پاکستانی نوجوان یہاں کس جگہ قید ہے؟"
بزرگ نے چونک کر کہا "کیا تم اسی کی تلاش میں آئے ہو؟"
حاتم طائی بولا "یہی سمجھ لیجیے۔ آپ جانتے ہیں وہ کس جگہ قید ہے؟"
بزرگ نے، سلاخوں کے پاس آکر، آہستہ سے کہا "کمال پر بڑا ظلم کیا ہے ان لوگوں نے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے۔"
حاتم نے جلدی سے پوچھا "مگر وہ ہے کہاں؟"
بزرگ نے سرگوشی میں کہا "اس وقت وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں ہے اور اس بدنصیب کو آج صبح یعنی دو گھنٹے بعد پھانسی دی جانے والی ہے۔"
حاتم طائی یہ سن کر کانپ گیا، بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے یہاں سے فوراً نکالنا ہو گا۔"
بزرگ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "میرے بچّے، اب وقت گزر چکا ہے۔ تم خود لوہے کی سلاخوں کے پنجرے میں بند ہو۔ اس کی کیا مدد کر سکو گے؟"

حاتم طائی نے مُسکرا کر کہا " مُحترم، میں خُدا کی مدد سے کمال کو اس کال کوٹھڑی سے نِکال کر لے جاؤں گا ۔"

بُزرگ نے گردن ہلا کر کہا " معلُوم ہوتا ہے قید کے صدمے کا تمھارے دماغ پر گہرا اثر ہوا ہے۔ جب ہی دیوانوں ایسی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم اس کے دوست ہو تو اس کی مغفرت کے لیے دُعا کرو، کیوں کہ دو گھنٹے بعد وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے گا ۔"

اب وقت سوچنے کا نہیں، عمل کا تھا۔ حاتم طائی نے اِسم پڑھ کر سلاخوں والے دروازے پر پھُونک ماری اور کہا :

" غائب ہو جا، اے دروازے !"

اور بُزرگ کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے سلاخوں والا دروازہ غائب ہو گیا اور حاتم طائی کوٹھڑی سے نِکل کر راہ داری میں آ گیا۔ اُس نے بُزرگ کا دروازہ بھی کھول دیا اور کہا :

" اگر آپ یہاں سے نِکل سکتے ہیں تو نِکل جائیں مجھے کمال کی جان بچانی ہے ۔"

یہ کہ کر اُس نے پھانسی کی کوٹھڑی کے بارے

میں بُزرگ سے معلومات حاصل کیں اور راہ داری میں آگے بڑھ گیا۔ راہ داری بائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ یہاں ایک سپاہی چل پھر کر پہرا دے رہا تھا۔ اُس نے حاتم کو دیکھا تو رائفل تان کر بولا "ہالٹ!"

مگر حاتم اس عرصے میں سپاہی پر پھُونک مار چُکا تھا۔ وہ پتّھر بن کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور حاتم بھاگتا ہُوا آگے نکل گیا۔ اُسے خطرہ تھا کہ کہیں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمال کو پھانسی نہ دے دی جائے۔

آگے جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک جگہ، کمرے میں، پھانسی گڑی ہے اور کمال تختے پر کھڑا ہے اور جلّاد اس کے مُنھ پر کالا نقاب ڈال رہا ہے۔ پولیس کا ایک انسپکٹر، وارڈن اور ڈاکٹر سامنے کھڑے تھے۔

حاتم طائی نے جلّاد کی طرف پھُونک مار کر کہا "غائب ہو جا، اے جلّاد!"

اور، سب کی نظروں کے سامنے، جلّاد ایک دم غائب ہو گیا۔ وارڈن اور پولیس انسپکٹر نے حیرت سے ایک دُوسرے کو دیکھا۔ پھر حاتم طائی پر اُن کی نظر پڑی تو انسپکٹر نے پستول نکال کر اس پہ فائر کر دیا۔

دو گولیاں حاتم کے سینے پر لگیں، لیکن اُچٹ کر نیچے گر پڑیں۔ وارڈن نے چلا کر کہا :

"میں پھانسی کا تختہ گراتا ہوں!"

وہ پھانسی کا تختہ گرانے کے لیے اُوپر چڑھ ہی رہا تھا کہ حاتم نے اسے وہیں پتھر بنا دیا۔ اب پولیس انسپکٹر نے دھڑا دھڑ حاتم طائی پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ مگر وہ اور ڈاکٹر ڈر کر دیوار کے ساتھ جا لگے تھے کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ گولیاں حاتم کے جسم پر لگ کر نیچے گر رہی ہیں اور اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ خون کا ایک قطرہ تک اس کے جسم سے نہیں نکلا تھا۔ حاتم نے اسم پڑھ کر اُن پر پھونک ماری تو وہ بھی اُسی جگہ پتھر بن کر کھڑے ہو گئے۔

حاتم لپک کر پھانسی کے تختے پر چڑھا اور کمال کے مُنہ پر ڈالا ہوا کالا نقاب اُتار کر پھینک دیا۔ پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں کی رسّیاں کھولنے لگا۔ کمال نے کمزور سی آواز میں پُوچھا :

"تم کوئی جنّ ہو یا فرشتے ؟"

حاتم طائی نے کہا "میں تمھارا دوست ہوں۔ میرا

نام حاتم طائی ہے، اور مجھے تمھاری والدہ نے تمھاری مدد کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"

جب کمال آزاد ہو گیا اور اُس نے جیل کے افسروں کو پتھر بنا دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ حاتم طائی نے کہا:

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ وقت بہت کم ہے فائر کی آوازوں نے جیل کے پہرے داروں کو ہوشیار کر دیا ہو گا۔"

ایسا ہی ہوا تھا۔ پھانسی گھر سے پستول کے فائر کی آوازیں سُن کر جیل کے پہرے دار رائفلیں لے کر پھانسی گھر کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ حاتم کمال کو لے کر اپنی کوٹھڑی کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے جیل کے عملے کے چار آدمی دو سپاہیوں کے ساتھ بندوقیں تانے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ حاتم نے اسم پڑھ کر زور سے کہا:

"چوہے بن کر بھاگ جاؤ!"

قُلابہ کا بتایا ہُوا اِسم ابھی تک ٹھیک کام کر رہا تھا۔ سُرنگ میں جو لوگ حاتم کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے، سارے کے سارے چوہے بن کر

سُرنگ کے کونوں کھدروں میں چھپ گئے۔

کمال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ ایسی جادوگری اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ صرف الف لیلہ اور طلسم ہوش رُبا میں پڑھی تھیں۔ حاتم طائی پر اُسے جادوگروں کے شہنشاہ کا گمان ہو رہا تھا، جو منتر پڑھ کر لوگوں کو جو چاہتا، بنا ڈالتا تھا۔

حاتم طائی نے کہا "بھائی، تم حیران ضرور ہوگے۔ ٹھیک ہے۔ بات ہی حیرانی کی ہے۔ مگر یہ وقت حیران ہونے کا نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔ باتیں بعد میں ہوں گی۔"

حاتم طائی کمال کو لے کر تہہ خانے کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے زیادہ فکر کمال ہی کی تھی کہ اس ہنگامے میں اس کے کوئی گولی نہ لگ جائے، اسی لیے وہ کمال کے آگے آگے چل رہا تھا تاکہ سامنے سے گولی آئے تو کمال کے بجائے اُس کے لگے۔

جب حاتم طائی تہہ خانے کی سُرنگ کے دروازے پر پہنچا تو اس نے باہر ایک جیپ کے رُکنے کی

آواز سُنی۔ اُس نے دروازے کی درز میں سے جھانکا اور پھر پلٹ کر کمال سے کہنے لگا:

"پولیس کی جیپ پہنچ گئی ہے۔ اُن کے پاس بندوقیں ہیں۔ وہ اندھا دُھند فائرنگ کریں گے۔ اس لیے تم اِس جگہ، دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے رہو۔ جب تک میں آواز نہ دُوں، اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہلنا۔ سمجھ گئے؟"

"بالکُل سمجھ گیا۔ تم فکر نہ کرو" کمال نے جواب دیا۔

کمال کو سُرنگ میں کھڑا کر کے حاتم طائی دروازے کی طرف بڑھا۔ سپاہیوں کا دستہ دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر پہرے دار نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کُھلتے ہی حاتم باہر نِکل گیا۔ سپاہیوں نے حاتم طائی کو دیکھتے ہی مشین گن کی باڑھ مار دی۔ خُدا جانے کتنی گولیاں حاتم کے جسم سے ٹکرا گئیں، مگر اُسے کُچھ نہ ہوا۔ اُس نے اِسم پڑھ کر زور سے پُھونک ماری اور کہا:

"کبُوتر بن کر اُڑ جاؤ!"

اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے کے سارے سپاہی

سُرمئی رنگ کے کبُوتر بن کر، پھڑپھڑاتے ہُوئے آسمان میں اُڑ گئے۔ میدان خالی پاکر حاتم نے کمال کو آواز دی۔ کمال سُرنگ سے باہر نِکل آیا۔ حاتم نے کہا:

"میرے ساتھ بھاگو!"

حاتم کمال کو لے کر لال قلعے کے دُوسرے تختے پر اس جگہ آیا جہاں انار کا درخت تھا اور جہاں رات کو اُسے چُڑیل نظر آئی تھی اور پرستان کی نیلم پری سے ملاقات ہوئی تھی۔

اب دِن کا اُجالا پھیلنا شرُوع ہو گیا تھا، اور لال قلعے کی بُرجیاں صُبح کی ہلکی روشنی میں دِکھائی دینے لگی تھیں۔ حاتم طائی نے کمال سے کہا:

"ہمیں دِن بھر کسی ایسی جگہ چھُپنا ہو گا جہاں ہم پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ ابھی قلعے کی تلاشی شروع ہو جائے گی۔ ساری پولیس ہمارا کھوج لگائے گی۔"

کمال نے کہا "مگر تم تو جسے چاہے غائب کر دیتے ہو، پتّھر بنا ڈالتے ہو، اور جانور بنا دیتے ہو۔ تمھیں بھی چھُپنے کی ضرُورت ہے؟"

حاتم نے کہا "یہ سب کچھ میں تمھارے لیے کر

رہا ہوں، کیوں کہ تم گولی سے نہیں بچ سکو گے۔"

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ حاتم چاہتا تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے کمال کو کسی محفوظ جگہ لے جاکر چھپا دے۔ اچانک اسے شاہی حماموں کا خیال آیا۔ لیکن کمال نے کہا:

"سپاہی ہمیں حماموں میں بھی تلاش کریں گے۔"

"پھر تمھارا کیا خیال ہے؟" حاتم نے پوچھا۔

کمال بولا "موتی مسجد کے نیچے ایک حجرہ ہے۔ یہاں کے ایک مالی نے مجھے بتایا تھا کہ اس حجرے میں بادشاہ رمضان کی راتوں کو عبادت کیا کرتا تھا۔ آؤ، وہاں جا کر چھپ جاتے ہیں۔"

موتی مسجد قریب ہی تھی۔ کمال اور حاتم مسجد کے پاس آکر حجرے میں جانے والا راستہ تلاش کرنے لگے۔ آخر انھیں ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا راستہ مل گیا۔ یہ ایک کھوہ سی تھی۔ دونوں جھک کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا زینہ نیچے اترتا تھا۔ آگے ایک چھوٹی کوٹھڑی تھی جس کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی اور سوراخوں میں سے تازہ ہوا اور ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ حاتم نے کمال سے کہا "یہ جگہ

ٹھیک رہے گی۔ ہم آج کا دن اور رات اِسی جگہ گزاریں گے، اور کل صُبح نِکل چلیں گے۔"

کمال نے پُوچھا "آج ہی رات کیوں نہ نِکل چلیں؟"

حاتِم طائی نے اُسے پرستان اور لال قلعے کی چُڑیل کا سارا قِصّہ سُنا کر کہا "آج رات میں چُڑیل کو ہلاک کر کے شہزادے اور شہزادی کو اُس کے پنجے سے نجات دلانا چاہتا ہُوں۔"

کمال نے کہا "تمھارے بارے میں جیسا پڑھا تھا، تم بالکل ویسے ہی ہو اور انسانوں کی اُسی طرح مدد کرتے ہو اور ان کی خاطر اپنے آپ کو مُصیبت میں ڈالتے ہو۔ مگر تم اپنا زمانہ چھوڑ کر ہمارے زمانے میں کیسے پہنچ گئے؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے، جو پھر کبھی سُناؤں گا۔ اب تم آرام کرو۔ میں باہر سے کچھ کھانے پینے کے لیے لاتا ہُوں۔"

"وہ لوگ تمھیں پکڑ نہ لیں!"

"وہ مُجھے نہیں پکڑ سکیں گے۔"

یہ کہ کر حاتِم حُجرے سے باہر نِکل آیا۔ اُس نے

کھوہ کے مُنہ پر جھاڑیوں کو اور زیادہ قریب کر دیا
تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ قلعے میں پھلوں کے بہُت
سے درخت تھے۔ ایک جگہ لوکاٹ کے پیڑوں پر
کیسری رنگ کے میٹھے میٹھے لوکاٹوں کے گچھّے لٹک
رہے تھے۔ حاتم جلدی جلدی گچھّے توڑنے لگا۔ اُسی
وقت ایک پوربی مالی جس کے سر پر لمبی سی چُٹیا
تھی، ڈنڈا لے کر حاتم کی طرف لپکا اور زور سے
بولا:

"ارے! کون ہو رے تُم، جو یُوں پھل توڑ
رہے ہو؟ ذرا ٹھہرو، تمُھاری کھبر لیتا ہُوں۔"

حاتم نے اُس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور
بڑے مزے سے لوکاٹوں کے گچھّے توڑ توڑ کر جھولی
میں ڈالنے لگا۔ پُوربی مالی نے حاتم کی کمر پر زور
سے ڈنڈا مارا۔ ڈنڈا اُچھل کر پوربیے کے ہاتھ
سے نکل گیا اور ایسی آواز آئی جیسے وہ کسی لوہے
کے بُت سے ٹکرایا ہو۔ پوربیا بوکھلا گیا۔ پھر جلدی
سے ڈنڈا اُٹھا کر حاتم کی کمر میں ٹھوکا دے کر
بولا "کون ہے بے تُو؟"

حاتم نے پُوربیے کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور کہا

"بن جا بیٹے، ہریل طوطا اور بیٹھ جا اِس ٹہنی پر۔"
اسی لمحے مالی ہریل طوطا بن کر لوکاٹ کے پیڑ کی ڈال پر بیٹھ گیا اور اپنی لال لال چونچ سے لوکاٹ کُتر کُتر کر کھانے لگا۔ حاتم مُسکرا کر بولا "اب تُو ٹھیک جگہ پر پہنچ گیا ہے۔"

اب اُس نے لوکاٹ جھولی میں رکھے اور حجرے میں جا کر کمال سے کہا "تم یہ کھاؤ۔ میں پانی لاتا ہُوں۔"

حاتم اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ بازار کی طرف گیا تو خوامخواہ کی مُصیبت میں پھنس جائے گا۔ وہ اسی جگہ چل پھر کر پانی تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹے سے حوض میں ایک فوّارہ چل رہا تھا۔ حاتم نے بڑے بڑے پتّے لے کر ان کا دونا بنایا، پہلے خُود جی بھر کر پانی پیا اور پھر کمال کو لے جا کر پلایا۔

دوپہر کو اُس نے کمال کو آم بھی لا کر کھلائے۔ اِسی طرح دن گزر گیا اور رات آ گئی۔ حاتم نے کمال سے کہا:

"اب میں انار کے درخت کے پاس جاتا ہُوں۔

نیلم پری کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ تم ہرگز ہرگز اس حُجرے سے باہر نہ نِکلنا۔ میں آدھی رات کے بعد واپس آؤں گا۔"

لال قلعے میں رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندے بھی سو گئے تھے۔ زمین دوز قید خانے کی جانب سے کسی وقت کسی سپاہی کی سیٹی اور کسی جیپ کے رُکنے یا سٹارٹ ہونے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ لوگ کمال اور حاتم کی تلاش میں پریشان تھے اور شہر میں جانے کہاں کہاں چھاپے مارتے پھر رہے تھے۔ حاتم خاموشی سے انار کے درخت کے سامنے ستون کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

جب رات آدھی گزر گئی تو جھانجر کی ہلکی ہلکی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد حاتم نے پرستان کی شہزادی کو دیکھا۔ وہ سفید موتیوں جڑے لباس میں، سر پہ ہیروں کا تاج رکھے، انار کے درخت کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی:

"اس قلعے کا شہزادہ سوتا ہے کہ جاگتا ہے؟"

شہزادی نے تین بار یہ جملہ دُہرایا۔ تیسری بار

انار کا درخت، پہلی رات کی طرح، جھومنے لگا۔ پھر درخت کی جگہ وہاں شہزادہ نمودار ہو گیا۔ شہزادی نے آگے بڑھ کر شہزادے کا ہاتھ تھاما اور رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"شہزادے، کیا ہماری مصیبت کے دن کبھی ختم نہ ہوں گے؟"

شہزادے نے کہا "میرے پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ میں چڑیل کی قید میں ہوں۔ تمھارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں!"

وہی پہلی رات والے جملے دہرائے جا رہے تھے۔ وہی پہلی رات والا ڈراما پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ حاتم طائی کو اب چڑیل کا انتظار تھا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکل کر شہزادے اور شہزادی کے پاس چلا گیا۔ شہزادہ اجنبی کو دیکھ کر پریشان ہوا تو شہزادی نے حاتم کے بارے میں شہزادے کو سب کچھ بتا دیا۔ شہزادے نے آہ بھری اور کہا:

"میرے دوست! تم اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہو؟ چڑیل تمھیں ہرگز زندہ نہ چھوڑے گی۔ وہ یا تو تمھیں کھا جائے گی، یا میری طرح درخت

بتا دے گی۔"

"یہ اُس کی آخری رات ہے۔ اُسے آنے دو۔ سارا تماشا تمھاری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چڑیل کے بھیانک قہقہے سے اندھیری رات کی فضا تھرّا اُٹھی۔ شہزادی سہم کر شہزادے کے پاس آ گئی۔ حاتم بھی اپنی جگہ پر ہوشیار ہو گیا۔ شہزادہ خوف سے لرزنے لگا تھا۔ اِتنے میں آم اور مولسری کے درختوں میں سے وہی ڈراؤنے چہرے والی چُڑیل نمودار ہوئی۔ آج اُس کے گلے کے عِلاوہ سر کے بالوں میں بھی سانپ پُھنکاریں مار رہے تھے۔ اس نے جو ایک اجنبی اِنسان کو وہاں دیکھا تو ایک دہشت ناک آواز اُس کے حلق سے نِکلی، جیسے اس کو کِسی نے ذبح کر دیا ہو۔ فوراً حاتِم کی طرف لپکی۔ حاتِم اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ یہ دیکھ کر چڑیل نے دو کالے سانپ حاتم کی طرف پھینکے۔

سانپ پھن اُٹھائے، اُڑتے ہوئے، آئے اور حاتِم طائی کے جسم سے چمٹ گئے۔ انھوں نے حاتِم کو جگہ جگہ سے ڈسا، مگر حاتِم پر اُن کے زہر کا کوئی

اثر نہ ہوا۔ اُلٹے سانپوں کے دانت ٹوٹ گئے۔ حاتم نے دونوں سانپوں کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔

چڑیل کو سانپوں کے مرنے پر غصّہ آگیا۔ وہ دانت نکال کر حاتم کی طرف بڑھی۔ حاتم نے اِسم پڑھ کر چڑیل پر پھونکا اور کہا:

"غائب ہو جا، اے چڑیل!"

لیکن چڑیل غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس کی طرف خونی دانت اور نوکیلے پنجے نکالے بڑھ رہی تھی۔ حاتم نے جلدی سے پھر اسم پڑھ کر پھونک ماری اور کہا:

"اے خبیث چڑیل، پتھر بن جا!"

مگر اس بار بھی اسم بے اثر رہا۔ چڑیل پتھر نہ بنی۔ اب حاتم پریشان ہو گیا کہ یہ تو مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور نکلی۔ اس نے تیسری بار اسم پڑھا اور کہا:

"بلّی بن جا، اے چڑیل!"

لیکن چڑیل بلّی بھی نہ بنی۔ اب تو حاتم بوکھلا سا گیا، کیوں کہ چڑیل شہزادے اور شہزادی دونوں کو ہلاک کر سکتی تھی، یا پھر کیا خبر کہ حاتم طائی کو ہی اُٹھا کر کہیں لے جائے۔

حاتم اپنے آپ کو چڑیل کے سامنے بے بس پا رہا تھا۔ چڑیل کا جادو اُس کے جادو سے زیادہ طاقت ور تھا۔

شہزادی اور شہزادہ بھی یہ سارا کھیل سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں بھی حاتم کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ چڑیل اب حاتم کے سر پر آ چکی تھی۔ اس نے حاتم کی گردن پکڑ کر زور سے دھکّا دیا تو وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اُس نے حاتم کو اپنے لمبے لمبے بازوؤں میں اُٹھایا اور سر کے اُوپر لا کر پُوری طاقت سے زمین پر پٹخ دیا۔ حاتم کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا تو اس کی ہڈّی پسلی ایک ہو گئی تھی، مگر حاتم تو پتّھر کا بنا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور چڑیل پر حملہ کر دیا۔ مگر چڑیل اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کی گردن اور سر کے سانپ بار بار حاتم کو ڈس رہے تھے۔

غرض ایک کُہرام مچا ہوا تھا۔ چڑیل نے حاتم طائی کی گردن پر لمبے نوکیلے دانت گاڑنے چاہے تو اُس کی گردن پتّھر کی طرح سخت نکلی۔ چڑیل کے دانت آدھے ٹوٹ گئے۔ حاتم طائی نے ہنس کر کہا:

"اے خبیث چڑیل! تو مجھے نہیں مار سکتی۔"

چڑیل ایک ڈراؤنا قہقہہ لگا کر حاتم کی طرف لپکی۔ اس نے حاتم کو زمین سے اٹھا کر درخت کی طرف اچھالا اور چیخ کر کہا:

"انار کا درخت بن جا!"

مگر حاتم پر بھی اس کے جادو کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر چڑیل کا جادو حاتم پر چل جاتا تو وہ ساری زندگی کے لیے انار کے درخت میں تبدیل ہو جاتا۔ اب چڑیل نے لپک کر حاتم کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اچانک حاتم کا ہاتھ چڑیل کے سر کے بالوں میں چلا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ چڑیل کے سر میں ایک کیل ٹھکی ہوئی ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ چڑیل پر اس کے اسم کا کیوں اثر نہیں ہو رہا ہے۔ اس نے کیل نکالنی چاہی تو چڑیل تڑپ کر پرے جا گری۔ حاتم نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اب کسی قیمت پر چڑیل کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے چڑیل کے سر میں ٹھکی ہوئی پیتل کی کیل نکال کر پھینک دی۔ کیل کا نکلنا تھا

کہ چڑیل کے بدن میں آگ لگ گئی۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چڑیل اپنے ہی شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کے بھسم ہوتے ہی شہزادے کے پاؤں زمین سے آزاد ہو گئے۔ اس نے اپنے پیروں کو ہلا کر دیکھا اور کہا :

"میں آزاد ہو گیا ! میں چل پھر سکتا ہوں !"

شہزادی اور شہزادہ دوڑے حاتم طائی کے پاس آئے۔ حاتم چڑیل سے لڑ لڑ کر بہت تھک گیا تھا، اور ستون سے ٹیک لگائے اپنا پھولا ہوا سانس درست کر رہا تھا۔

شہزادی اور شہزادے نے حاتم کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پھر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مولسری کے درخت کے اوپر سے اُڑ کر تاروں بھرے آسمان میں غائب ہو گئے۔ حاتم طائی کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اُٹھا اور موتی مسجد کے حجرے کی طرف چل پڑا وہ دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ کمال وہاں موجود ہو۔

پھنس گیا

کمال موتی مسجد کے حجرے میں سہما بیٹھا تھا۔ اُس نے چڑیل کی چیخیں اور ڈراؤنے قہقہے سنے تھے۔ کیوں کہ موتی مسجد انار کے درخت کے قریب ہی تھی۔ حاتم نے اُسے بتایا کہ اُس نے چڑیل کو جلا کر بھسم کر دیا ہے، اور شہزادہ اور شہزادی پرستان چلے گئے ہیں۔ کمال کہنے لگا:

"حاتم، تم جو باتیں کرتے ہو اُس سے مجھے الف لیلہ کی کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ کیا آج کی سائنسی دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شہزادے اور شہزادیاں اُڑ کر پرستان چلے جائیں؟"

حاتم طائی نے پوچھا "تم نے چڑیل کی چیخیں سنی تھیں؟"

"ہاں، سنی تھیں، اور اُنھیں سن کر میں سہم گیا تھا۔"

حاتم نے کہا "تو پھر یقین کرو شہزادہ اور شہزادی بھی پرستان چلے گئے ہیں۔ اچھا خیر، چھوڑو اِن باتوں

کو۔ ابھی رات باقی ہے۔ ہمیں پچھلے پہر کے اندھیرے سے فائدہ اُٹھا کر اسی وقت لال قلعے سے نِکل جانا چاہیے۔ تمھارا کیا خیال ہے ؟"

کمال نے کہا " اس سے اچّھا خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ کل سارا دن یہاں چھُپے رہنے کا خطرہ ہمیں مول نہیں لینا چاہیے۔"

"تو پھر آؤ، میرے ساتھ۔"

حاتم طائیؔ کمال کو لے کر موتی مسجد کے حُجرے سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کمال نے آہستہ سے پُوچھا:

"ہم اس وقت کہاں جائیں گے ؟"

حاتم طائیؔ نے کہا " میرا خیال ہے، ہم باقی رات اور کل کا دِن قلعے سے دُور کسی جگہ گُزاریں اور کل رات سرحد کی طرف نکل چلیں۔"

کمال کہنے لگا " دِلّی کے ایک محلّے بلّی ماراں میں میرے ایک دُور کے ماموں رہتے ہیں۔ وہ ہماری ضرور مدد کریں گے۔"

" یہ تو بڑی اچھّی بات ہے" حاتم نے خوش ہو کر کہا۔

اُنھوں نے قلعے کی پچھلی جانب سے فصیل پار کی اور پچھلے پہر کے دُھندلکے میں ویران علاقوں سے ہوتے ہُوئے محلّہ بلّی ماراں میں پہنچ گئے۔ گلی سُنسان تھی۔ کمال نے دروازے پر دستک دی۔ کمال کے ماموں نماز کے لیے بیدار ہو چُکے تھے۔ وہ کمال کو دیکھ کر بڑے خُوش ہُوئے۔ کمال نے حاتم کا تعارُف کروایا اور ساری کہانی کہ سُنائی۔ وہ حاتم طائی کے کمالات سُن کر دنگ رہ گئے۔

انھوں نے کمال کو مکان کے نیچے ایک تہہ خانے میں چھُپا دیا۔ دوپہر کا کھانا انھوں نے اسی جگہ کھایا اور پھر دِلّی سے فرار ہونے کے منصُوبے سوچتے رہے۔ آخر یہ طے پایا کہ حاتم بھیس بدل کر شہر جائے اور دِلّی سے امرتسر جانے والی ریل کے دو ٹکٹ خرید لائے۔ یہ گاڑی دِلّی سے رات کے نو بجے روانہ ہوتی تھی۔ حاتم طائی دوپہر کے کھانے کے بعد بھیس بدل کر سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا اور پنجاب ایکسپریس کے فسٹ کلاس کی دو سیٹیں ریزور کروا لیں۔ رات کے آٹھ بجے کمال نے اپنے ماموں سے اِجازت لی، اُن کا شکریہ ادا کیا

اور دونوں رات کے اندھیرے میں چھپتے چھپاتے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔

فسٹ کلاس میں ان کی سیٹیں خالی تھیں۔ فسٹ کلاس کی سواریوں کو رات میں جگایا نہیں جاتا۔ اس طرح وہ بڑے سکون سے رات بھر ٹرین میں سفر کرتے اور اگلے روز صبح ہی کو امرتسر جا اُترتے۔

امرتسر تک سفر آرام سے کٹ گیا۔ نہ کوئی ٹی ٹی ان کے ڈبّے میں آیا اور نہ کسی پولیس والے کو جرأت ہوئی کہ ان کے آرام میں خلل ڈالے۔ امرتسر کے سٹیشن پر اُتر کر حاتم نے کمال کو ساتھ لیا اور ہوٹل کے بجائے شہر سے دُور کھیتوں میں چلا گیا۔ اِنھی کھیتوں میں بیٹھ کر انھوں نے دال روٹی کھائی، کنویں کا پانی پیا اور جب آدھی رات ہوئی تو پاکستان کی سرحد کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں اس راستے سے واقف تھے جو کھائیوں، خشک نالوں اور بنجر میدانوں سے ہو کر جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑی سڑک سے اُتر کر کچے راستے پر آ گئے اور پھر کھیتوں میں چلنے لگے۔ اس کے بعد بنجر زمین آ گئی۔ یہاں جگہ جگہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

رات اندھیری تھی۔ بھارتی سرحدی پولیس کا ایک دستہ جیپ میں گشت کرتا ہُوا گزر گیا۔ اُسے دیکھ کر دونوں ایک گڑھے میں چھُپ گئے۔ جیپ آگے نکل گئی۔ تو گڑھے سے باہر نکلے اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوتے ہُوئے سرحد پر پہنچ گئے۔ سامنے ایک کچّا راستہ تھا جس کو عبُور کر کے وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہو جاتے۔

کمال نے کہا کہ یہاں بھارت کے مورچے ہیں اور بھارتی سپاہی سرحد پار کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولیاں برسانی شروع کر دیتے ہیں۔ حاتم نے کہا "تم میرے آگے آگے رہنا۔ گولیاں میرے لگیں گی۔ تم بچ جاؤ گے۔ ہمیں یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے"

اُس نے کمال کو اپنے آگے کیا اور اُس کے پیچھے پیچھے ڈھال بن کر چلنے لگا۔ کچّے راستے پر پہنچ کر انھوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اچانک پیچھے سے بھارتی مورچوں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیوں کا ایک برسٹ حاتم طائی کی کمر سے ٹکرایا۔ اس کے بعد رائفل کی گولیاں کبھی اس کی گردن، سر، پیٹھ اور

پنڈلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر گرتی رہیں۔
حاتم کمال کے آگے ڈھال بنا رہا اور اُسے کوئی گزند نہ پہنچا۔ آخر وہ سرحد عبور کر گئے، اور رینگ رینگ کر کافی دُور نکل آئے تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب وہ پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گئے تھے۔
حاتم طائی کمال کو بارڈر پولیس کے دفتر میں لے گیا اور چیف انسپکٹر کو ساری داستان سُنائی۔ چیف انسپکٹر نے ہیڈ کوارٹر فون کیا اور اس کی ہدایت پر اِن دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کمال کی ماں حوالات میں اپنے بیٹے سے ملی۔ اُس نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور حاتم طائی کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اُس نے وکیل کر کے دونوں کو ضمانت پر رہا کرا لیا۔ آخر فیصلہ اُن کے حق میں ہوا اور ڈھاکے کی گڑبڑ میں فرار ہونے والوں کی لسٹ میں آ کر وہ بری ہو گئے۔
لاہور میں گرمی بڑھ گئی تھی۔ مئی کا مہینا تھا۔ سارا دن گرم لُو چلتی رہی حاتم نے سوچا کہ کیوں نہ پاکستان کے صحت افزا مقام کوہ مری کی سیر کی جائے۔ پس وہ ایک روز ٹرین میں سوار ہو کر راولپنڈی آ گیا۔

اِس شہر میں حاتم نے شیشم کے درخت دیکھے تو اُس کا دِل باغ باغ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مری جانے سے پہلے پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد بھی دیکھ لیا جائے۔ وہ اسلام آباد پہنچا تو اُسے یہ شہر بہُت پسند آیا۔ کھُلی کشادہ سڑکیں، خوُب صُورت عمارتیں اور چاروں طرف اُونچی اُونچی پہاڑیاں۔

ایک روز حاتم سیر کرتے کرتے اسلام آباد کے ہوائی اڈّے پر پہنچ گیا۔ وہ شام کے کھانے کے بعد اپنے ہوٹل سے یُوں ہی ذرا ٹہلنے نکلا تھا۔ ہوائی اڈّے پر جہاز کھڑے تھے۔ حاتم کو ہوائی جہاز دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اب تک یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ اِتنا بڑا اور وزنی جہاز اچانک کیسے ہوا میں اُڑنا شروع کر دیتا ہے!

ایک جیٹ مُسافر طیّارہ ہوائی اڈّے سے ذرا دُور، رن وے پر، کھڑا تھا۔ حاتم کا دل چاہا کہ اِس ہوائی جہاز کو اندر سے جا کر دیکھنا چاہیے۔ وہ کھیتوں سے ہوتا ہوا رن وے پر اس جگہ آ گیا جہاں وہ خوُب صُورت جیٹ طیّارہ کھڑا تھا۔ اِتّفاق سے وہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ حاتِم طیّارے کے قریب

جا کر اس کے پہیّوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جہاز کے اُوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا، کیوں کہ ابھی اُس پر سیڑھی نہیں لگی تھی۔

حاتم نے دیکھا کہ طیّارے کے پہیّوں کے اُوپر ایک چوکور سوراخ ہے۔ اس نے خیال کیا کہ اِس سوراخ میں سے جہاز کے اندر راستہ جاتا ہو گا۔ وہ سوراخ میں سے جہاز کے اندر جائے گا اور سیر کر کے واپس آ جائے گا۔

وہ پہیّوں کے اُوپر چڑھا اور سوراخ کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جس کے اندر، جہاز کے اُڑنے کے بعد، پہیّے سِمٹ کر بند ہو جاتے ہیں۔ حاتم اندر گیا تو دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا کمرا ہے۔ دونوں طرف چوکور سیٹ بنی ہوئی تھی۔

ایک جانب ایک ڈائیل لگا تھا جس کے اُوپر سُرخ اور سبز بلب لگے تھے۔ نیچے چاندی کی طرح چمکتا ہوا ایک بٹن تھا۔ حاتم کا دِل اس بلب کو جلانے کو چاہا۔ اُسے یہ پتا نہ تھا کہ یہ بٹن اُس کے لیے کِس قِسم کی مُصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنے شوق کی تسکین کی خاطر، سوچے سمجھے بغیر، بٹن

دبا دیا۔
بٹن دب گیا، مگر کوئی بلب روشن نہ ہُوا۔ لیکن ایک زبردست تبدیلی اس چھوٹے سے آہنی کمرے میں پیدا ہو چکی تھی۔ کمرے کے سوراخ کا آہنی دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔ حاتم کی نظر دروازے پر اُس وقت پڑی جب وہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی، مگر دروازہ تو گویا پتّھر کا بنا ہوا تھا۔ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارے، لیکن دروازے پر ذرا بھی اثر نہیں ہُوا۔

اب تو حاتم گھبرا گیا۔ اس نے دروازے کو غائب کرنے کے بارے میں سوچا تو خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ پُورے کا پُورا جہاز ہی غائب ہو جائے اور اُس کے ساتھ وہ خُود بھی اِس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو جائے۔

یہ جہاز ایئر فرانس کا تھا اور چیکنگ کے بعد رن وے پر کھڑا تھا۔ اُس کی پرواز میں صرف آدھ

گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد حاتم نے محسوس کیا کہ جہاز کا انجن سٹارٹ ہوا اور اُس نے آہستہ آہستہ رن وے پر چلنا شروع کر دیا ہے۔

جہاز کنٹرول ٹاور کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں مسافروں کی قطار لگی تھی۔ جہاز میں سیڑھی لگا دی گئی اور مسافروں نے سوار ہونا شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد سیڑھی ہٹا دی گئی اور جہاز کے انجن سٹارٹ کر دیے گئے۔ جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا اور اُوپر فضا میں بلند ہو گیا۔

حاتم نچلے کمرے میں سیٹ کو پکڑے بیٹھا تھا۔ وہاں بے پناہ شور تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ سوراخ کا دروازہ اپنے آپ کھل رہا ہے۔ دروازہ کھلنے سے ہوا کا زبردست جھونکا آیا، جیسے خوف ناک آندھی چل رہی ہو۔ اُس نے سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب دروازہ پورا کھل گیا تھا اور طیارے کے بڑے بڑے پہیے اندر کو سمٹ رہے تھے۔ ایک پہیا حاتم طائی کے کندھوں کے قریب سے ہو کر چھت کے ساتھ جا لگا۔ جب طیارے کے پہیے اندر آ گئے تو کمرے کا سوراخ ایک بار پھر اپنے آپ بند ہو گیا۔

حاتم اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پہیّوں کے ٹائروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایک ٹائر کو چھوا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ جس وقت پہیّے اندر آ رہے تھے، اُس وقت جہاز زمین سے کئی ہزار فُٹ کی بلندی پر تھا، اور حاتم طائی ذرا بھی غفلت کرتا تو نیچے زمین پر گر پڑتا

جب کمرے کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا تو حاتم نے خُدا کا شُکر ادا کیا۔ جہاز کسی خاص پرواز پر تھا اور وہ اسلام آباد سے اُڑ کر، خلیج فارس عبُور کر کے، ایران کے اُوپر سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قاہرہ کے ہوائی اڈّے کے اُوپر سے گزُر رہا تھا۔ جس کمرے میں حاتم بند تھا، اس میں ہوا کی رگڑ سے زبردست شور پیدا ہو رہا تھا۔ حاتم کے کان اِس شور سے پھٹے جا رہے تھے۔ اُس نے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ کوئی چھ سات گھنٹے کے سفر کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ جہاز نیچے اُتر رہا ہے۔

ایک بار پھر سُوراخ اپنے آپ کھُلنا شروع ہو گیا حاتم نے اپنی سیٹ کو مضبُوطی سے پکڑ لیا۔ پہیّے خُود بخُود

نیچے جا رہے تھے۔ ہوا کا زبردست جھونکا پہیّوں سے ٹکرایا تو ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے بم پھٹ رہے ہوں۔ حاتم خُدا کو یاد کرتا رہا اور سیٹ کے ساتھ چمٹا رہا۔

آخر جہاز کے پہیّوں نے رن وے کو چھُوا۔ ایک شعلہ سا زمین سے نکلا، بڑے زور کی آواز پیدا ہوئی، اور جہاز نے دوڑنا شروع کر دیا۔ کافی آگے جا کر اس کی رفتار میں کمی آنا شروع ہو گئی اور آخر وہ ایک جگہ رُک گیا۔ حاتم نے خُدا کا شُکر ادا کیا۔ وہ سُوراخ میں سے نکلنے ہی لگا تھا کہ اس نے دو گورے آدمیوں کو دیکھا کہ پہیّوں کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی رکاوٹیں رکھ رہے ہیں۔ حاتم فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ جب وُہ لوگ چلے گئے تو وہ پہیّوں پر سے ہوتا ہوا نیچے اُتر آیا۔

ایک بار پھر زمین پر پاؤں رکھتے سے اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ فضا میں سردی ہے۔ لاہور اور اسلام آباد کی سی گرمی یہاں نہیں تھی۔ آسمان بھی بادلوں میں چھُپا ہُوا تھا اور اگرچہ دِن تھا مگر روشنی زیادہ نہ تھی۔

جہاز کے باہر مسافروں کی قطار لگی تھی جو ایک بس میں سوار ہو رہے تھے۔ حاتم سمجھ گیا کہ ان لوگوں کے پاسپورٹوں کی چیکنگ ہو گی اور اُس کے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں ہے۔ اِس لیے وہ وہاں سے پرے ہٹ کر، رن وے کی دُوسری جانب کھیتوں کی طرف، چلنے لگا۔ اُسے یہ خطرہ تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف دھند پھیل رہی تھی اور بیس پچیس قدم کے فاصلے پر چیزیں دُھندلی نظر آتی تھیں۔ اِس دُھند نے حاتم کو ہوائی اڈّے کے حفاظتی جنگلے تک پہنچنے میں بڑی مدد دی۔

جنگلا خار دار تھا۔ حاتم نے بڑی مُشکل سے اُسے پار کیا۔ سامنے کھیت تھے اور ان میں سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس قِسم کے کھیت حاتم نے پاکِستان اور ہندوستان میں نہیں دیکھے تھے۔ اُسے محسُوس ہوا کہ وہ مشرق سے نِکل کر کِسی مغربی مُلک میں آ گیا ہے۔ مگر یہ مُلک کون سا ہے، یہ معلوم کرنا باقی تھا۔

حاتم کی جیب میں اُس وقت دو سو پاکستانی نوٹ تھے۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ کھیتوں میں کچھ دیر چلنے کے بعد ایک پکّی سڑک آ گئی۔ یہاں سفیدے کے اُونچے اُونچے درخت تھے۔ ایک نیلے رنگ کی کار اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اس کے بعد دو تین کاریں گزریں۔ پھر ایک ٹرک گزرا۔ اُس نے یُوں ہی مُنہ اُٹھائے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔

اب سڑک کے ایک طرف کاٹج نُما مکان شروع ہو گئے تھے۔ یہاں اُونچی نیچی پہاڑیاں بھی تھیں۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

وہ ایک مکان کے قریب سے گزرا تو اچانک کسی عورت کی چیخ کی آواز آئی۔ یہ چیخ سُن کر حاتم کی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا اور وہ مکان کی طرف لپکا۔

مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ ایک کھڑکی کے پاس جا کر حاتم نے اُسے دھکّا دیا تو اس کا پٹ کھُل گیا اور وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر خاموشی تھی۔ اُس نے سُننے کی کوشش کی مگر عورت کی چیخ

دوبارہ سُنائی نہیں دی۔ حاتم دبے پاؤں چلتا ہُوا دُوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا بھی سجا ہُوا تھا اور دیواروں کے ساتھ الماریوں میں کتابیں رکھی تھیں۔

اچانک حاتم نے کسی آدمی کو تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کا چہرہ بڑا ڈراؤنا تھا۔ چہرے پر لمبی لمبی مُونچھیں تھیں اور ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ باہر کار کھڑی تھی۔ اس آدمی نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ کار میں داخل ہوتے ہوئے اس کی نگاہ حاتم پر پڑ گئی۔ حاتم کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ اس آدمی نے جیب سے پستول نکال کر حاتم پر دو بار گولی چلائی اور کار میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔

دونوں گولیاں حاتم کے سر پر لگی تھیں اور وہ آدمی اپنی طرف سے حاتم کو ہلاک کر گیا تھا۔ مگر گولیاں حاتم کے سر سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی تھیں۔ حاتم اس آدمی کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو یہ معلُوم کرنا چاہتا تھا کہ جس عورت کی چیخ کی آواز آئی تھی، وہ کہاں ہے۔ اِتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ وہ تیسرے کمرے میں داخل ہوا تو سارا راز کھُل گیا۔

حاتم کی جیب میں اُس وقت دو سو پاکستانی نوٹ تھے۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس اور کُچھ نہ تھا۔ کھیتوں میں کُچھ دیر چلنے کے بعد ایک پکّی سڑک آ گئی۔ یہاں سفیدے کے اُونچے اُونچے درخت تھے۔ ایک نیلے رنگ کی کار اس کے قریب سے ہو کر گزُر گئی۔ اس کے بعد دو تین کاریں گزریں۔ پھر ایک ٹرک گزُرا۔ اُس نے یُوں ہی مُنہ اُٹھائے ایک طرف چلنا شرُوع کر دیا۔

اب سڑک کے ایک طرف کاٹج نُما مکان شرُوع ہو گئے تھے۔ یہاں اُونچی نیچی پہاڑیاں بھی تھیں۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ ایک مکان کے قریب سے گزُرا تو اچانک کِسی عورت کی چیخ کی آواز آئی۔ یہ چیخ سُن کر حاتم کی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا اور وہ مکان کی طرف لپکا۔

مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ ایک کھڑکی کے پاس جا کر حاتم نے اُسے دھکّا دیا تو اس کا پٹ کُھل گیا اور وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر خاموشی تھی۔ اُس نے سُننے کی کوشش کی مگر عورت کی چیخ

دوبارہ سُنائی نہیں دی۔ حاتم دبے پاؤں چلتا ہُوا دُوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا بھی سجا ہُوا تھا اور دیواروں کے ساتھ الماریوں میں کتابیں رکھی تھیں۔

اچانک حاتم نے کسی آدمی کو تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کا چہرہ بڑا ڈراؤنا تھا۔ چہرے پر لمبی لمبی مُونچھیں تھیں اور ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ باہر کار کھڑی تھی۔ اس آدمی نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ کار میں داخل ہوتے ہوئے اس کی نگاہ حاتم پر پڑ گئی۔ حاتم کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ اس آدمی نے جیب سے پستول نکال کر حاتم پر دو بار گولی چلائی اور کار میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔

دونوں گولیاں حاتم کے سر پر لگی تھیں اور وہ آدمی اپنی طرف سے حاتم کو ہلاک کر گیا تھا۔ مگر گولیاں حاتم کے سر سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی تھیں۔

حاتم اس آدمی کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو یہ معلُوم کرنا چاہتا تھا کہ جس عورت کی چیخ کی آواز آئی تھی، وہ کہاں ہے۔ اِتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ دال میں کُچھ کالا کالا ضرُور ہے۔ وہ تیسرے کمرے میں داخل ہُوا تو سارا راز کھُل گیا۔

یہ ایک خواب گاہ تھی جہاں بڑا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پلنگ پر ایک گوری چٹی بوڑھی عورت کی لاش پڑی تھی۔ حاتم دم بخود رہ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے عورت کو دیکھا۔ وہ بے چاری مر چکی تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک لمبا سا خنجر پڑا تھا۔ حاتم خنجر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس پر ابھی تک سُرخ خُون لگا ہُوا تھا۔

اِتنے میں اچانک کسی کار کے رُکنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی تین چار سپاہی جنھوں نے نیلی خُوب صُورت وردیاں پہن رکھی تھیں اندر داخل ہُوئے۔ ان میں سے ایک اِنسپکٹر تھا۔ اس نے حاتم کو گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی۔

حاتم نے گھبرا کر کہا "میں نے اِس عورت کو قتل نہیں کیا۔ اِسے جس آدمی نے قتل کیا ہے، وہ ابھی ابھی ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہو گیا ہے۔"

اِنسپکٹر نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور پھر حاتم کو کار میں بِٹھا کر تھانے لے گیا۔

سپاہیوں میں سے ایک آدمی ٹُوٹی پھُوٹی عربی جانتا تھا۔ اُس نے حاتم سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اُس نے بُوڑھی عورت کا خُون کیوں کیا؟ حاتم نے کہا:

"میرا نام حاتم طائی ہے۔ میں عرب سے پاکستان گیا تھا اور غلطی سے ایک جہاز میں بند ہو کر یہاں آ گیا۔ میں نے اس عورت کو نہیں مارا"۔

سپاہی ہنسنے لگا۔ اُسے حاتم کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عرب دہشت پسند ہے اور اس کا کام عورتوں کو ہلاک کر کے یہاں دہشت پھیلانا ہے۔ اب پاگلوں ایسی باتیں کر کے قتل کے الزام سے بچنا چاہتا ہے۔

حاتم نے پُوچھا "یہ کون سا مُلک ہے؟"

سپاہی نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا تم اتنے ہی بھولے ہو کہ تمھیں یہ بھی پتا نہیں کہ جس مُلک میں تم اس عورت کا خُون کرنے آئے ہو، اُس ملک کا نام کیا ہے؟"

حاتم نے کہا "میں قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ میں بالکل بے گُناہ ہُوں اور میں غلطی سے اِس مُلک میں آ گیا ہُوں"۔

سپاہی نے کہا "تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ خنجر تمھارے پاس سے برآمد ہُوا ہے۔ تم پھانسی کے پھندے سے نہیں بچ سکتے"۔

یہ ایک خواب گاہ تھی جہاں بڑا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پلنگ پر ایک گوری چِٹّی بوڑھی عورت کی لاش پڑی تھی۔ حاتم دم بخود رہ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے عورت کو دیکھا۔ وہ بے چاری مر چکی تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک لمبا سا خنجر پڑا تھا۔ حاتم خنجر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس پر ابھی تک سُرخ خُون لگا ہُوا تھا۔

اِتنے میں اچانک کسی کار کے رُکنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی تین چار سپاہی جنھوں نے نیلی خُوب صُورت وردیاں پہن رکھی تھیں اندر داخل ہُوئے۔ ان میں سے ایک اِنسپکٹر تھا۔ اس نے حاتم کو گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی۔

حاتم نے گھبرا کر کہا "میں نے اِس عورت کو قتل نہیں کیا۔ اِسے جس آدمی نے قتل کیا ہے، وہ ابھی ابھی ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہو گیا ہے۔"

اِنسپکٹر نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور پھر حاتم کو کار میں بِٹھا کر تھانے لے گیا۔

سپاہیوں میں سے ایک آدمی ٹُوٹی پھُوٹی عربی جانتا تھا۔ اُس نے حاتم سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اُس نے بُوڑھی عورت کا خُون کیوں کیا؟ حاتم نے کہا:

"میرا نام حاتم طائی ہے۔ میں عرب سے پاکستان گیا تھا اور غلطی سے ایک جہاز میں بند ہو کر یہاں آ گیا۔ میں نے اس عورت کو نہیں مارا۔"

سپاہی ہنسنے لگا۔ اُسے حاتم کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عرب دہشت پسند ہے اور اس کا کام عورتوں کو ہلاک کر کے یہاں دہشت پھیلانا ہے۔ اب پاگلوں ایسی باتیں کر کے قتل کے الزام سے بچنا چاہتا ہے۔

حاتم نے پُوچھا "یہ کون سا مُلک ہے؟"

سپاہی نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا تم اِتنے ہی بھولے ہو کہ تمھیں یہ بھی پتا نہیں کہ جس مُلک میں تم اس عورت کا خُون کرنے آئے ہو، اُس ملک کا نام کیا ہے؟"

حاتم نے کہا "میں قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ میں بالکل بے گُناہ ہُوں اور میں غلطی سے اِس مُلک میں آ گیا ہُوں۔"

سپاہی نے کہا "تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ خنجر تمھارے پاس سے برآمد ہُوا ہے۔ تم پھانسی کے پھندے سے نہیں بچ سکتے۔"

حاتم نے سر پکڑ لیا۔ پھر آہستہ سے بولا "کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ میں کس شہر میں ہوں؟"

سپاہی نے کہا "یہ فرانس کا شہر پیرس ہے۔"

"پیرس!"

"ہاں، اور تھوڑی دیر بعد تم جیل میں ہو گے۔"

انسپکٹر نے فرانسیسی زبان میں سپاہی سے پوچھا کہ یہ عرب کیا کہہ رہا ہے۔ سپاہی نے انسپکٹر کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو حاتم اور اس کے درمیان ہوئی تھیں۔

پولیس کی گاڑی حاتم کو لے کر پیرس شہر کے خوب صورت اور روشنیوں والے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ جب دریائے سین کا شان دار پل بھی گزر گیا تو گاڑی پیرس کے سب سے بڑے تھانے میں داخل ہو گئی۔ حاتم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی۔ اسے گاڑی سے نکال کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات میں لوہے کی ایک میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ لوہے کا پلنگ پڑا تھا۔ سامنے منہ ہاتھ دھونے کا نل تھا۔ دروازے پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، اور ایک نیلی وردی والا سپاہی، رائفل کندھے پر رکھے، پہرا دے رہا تھا۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ کسی نے حاتم طائی کو نہ پُوچھا پھر اُسے ایک طشتری میں کھانے کو ڈبل روٹی اور اُبلے ہُوئے آلُو دِیے گئے۔

رات ہو گئی۔ حوالات کے باہر برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ پہرے دار سپاہی شاید آرام کرنے چلا گیا تھا۔ حاتم پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ وہ یہاں سے کیسے نِکلے؟ وہ ان لوگوں پر اپنی بے گناہی ثابت کر کے رِہا ہونا چاہتا تھا۔

اِتنے میں، برآمدے میں، کسی کے بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ حاتم نے دیکھا کہ ایک سپاہی اُس کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ اُسے رِہا کرنے آ رہا ہے۔ لیکن جب وہ قریب آیا تو حاتم بوکھلا گیا۔ اس نے اُسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس بُوڑھی عورت کو قتل کیا تھا اور اب شاید حاتم کو ہلاک کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ حاتم اس کے قتل کا چشم دید گواہ تھا اور اس کی گواہی پر اس شخص کو پھانسی دی جا سکتی تھی۔

قاتِل نے پستول نکال کر حاتم پر دو فائر کیے۔

حاتم نے سر پکڑ لیا۔ پھر آہستہ سے بولا "کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ میں کس شہر میں ہوں؟"

سپاہی نے کہا "یہ فرانس کا شہر پیرس ہے"

"پیرس!"

"ہاں، اور تھوڑی دیر بعد تم جیل میں ہو گے"

انسپکٹر نے فرانسیسی زبان میں سپاہی سے پوچھا کہ یہ عرب کیا کہہ رہا ہے۔ سپاہی نے انسپکٹر کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو حاتم اور اس کے درمیان ہوئی تھیں۔

پولیس کی گاڑی حاتم کو لے کر پیرس شہر کے خوب صورت اور روشنیوں والے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ جب دریائے سین کا شان دار پل بھی گزر گیا تو گاڑی پیرس کے سب سے بڑے تھانے میں داخل ہو گئی۔ حاتم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی۔ اسے گاڑی سے نکال کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات میں لوہے کی ایک میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ لوہے کا پلنگ پڑا تھا۔ سامنے منھ ہاتھ دھونے کا نل تھا۔ دروازے پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، اور ایک نیلی وردی والا سپاہی، رائفل کندھے پر رکھے، پہرا دے رہا تھا۔

ایک گھنٹا گُزر گیا۔ کسی نے حاتم طائی کو نہ پُوچھا پھر اُسے ایک طشتری میں کھانے کو ڈبل روٹی اور اُبلے ہُوئے آلُو دِیے گئے۔

رات ہو گئی۔ حوالات کے باہر برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ پہرے دار سپاہی شاید آرام کرنے چلا گیا تھا۔ حاتم پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ وہ یہاں سے کیسے نکلے؟ وہ ان لوگوں پر اپنی بے گناہی ثابت کر کے رہا ہونا چاہتا تھا۔

اِتنے میں، برآمدے میں، کسی کے بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ حاتم نے دیکھا کہ ایک سپاہی اُس کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ اُسے رِہا کرنے آ رہا ہے۔ لیکن جب وہ قریب آیا تو حاتم بوکھلا گیا۔ اس نے اُسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس بُوڑھی عورت کو قتل کیا تھا اور اب شاید حاتِم کو ہلاک کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ حاتِم اس کے قتل کا چشم دید گواہ تھا اور اس کی گواہی پر اس شخص کو پھانسی دی جا سکتی تھی۔

قاتِل نے پستول نکال کر حاتِم پر دو فائر کیے۔

پستول کے آگے سائی لینسر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے گولی چلنے کا دھماکا نہیں ہوا۔ حاتم ایک دم پیچھے ہٹا۔ قاتل سمجھا کہ حاتم پیچھے گر رہا ہے۔ دونوں گولیاں اُس کے سامنے حاتم کے سینے پر لگی تھیں۔ اس لیے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ حاتم چند سکنڈ میں مر جائے گا۔

گولی چلا کر وہ بڑی تیزی سے بھاگ گیا۔ حاتم نے شور مچا دیا۔ چند سپاہی دوڑے دوڑے اُس کے پاس آئے۔ اُن میں وہ سپاہی بھی تھا جو عربی جانتا تھا۔ حاتم نے اُسے سمجھایا کہ ابھی ابھی وہی قاتل اس پر دو گولیاں چلا کر گیا ہے جس نے بوڑھی عورت کو قتل کیا تھا۔ سپاہی نے کہا:

"مگر تمھارے جسم پر تو گولی کا ایک بھی زخم نہیں ہے۔"

حاتم نے دونوں گولیاں فرش پر سے اُٹھا کر سپاہی کو دیں اور کہا "یہ دیکھو، یہ گولیاں اُس نے مجھ پر چلائی تھیں، مگر میں بچ گیا۔"

اسی وقت پولیس اِنسپکٹر بھی وہاں آ گیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر کسی شخص نے

گولیاں چلائی ہیں تو حاتم زخمی کیوں نہیں ہوا اور اگر گولیاں دیوار پر لگی تھیں تو پھر دیوار پر اُن کا نشان کیوں نہیں ہے ! حاتم کے پاس ان سوالات کا جواب تھا، مگر وہ جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ پولیس اِنسپکٹر نے سپاہی سے کہا :

"یہ شخص بہت چالاک ہے۔ گولیاں اُس نے اپنی جیب سے نکالی ہیں۔ اس کو لے جا کر نیچے تہ خانے میں بند کر دو "

اور حاتم طائی کو تھانے کے تہ خانے میں لے جاکر بند کر دیا گیا۔

حاتم طائی وہاں سے کیسے فرار ہُوا ؟
کیا حاتم طائی کو پھانسی دے دی گئی ؟
پیرس میں حاتم طائی کو کیسے سنسنی خیز واقعات پیش آئے اور پُرانے شاہی قلعے میں اس کی ملاقات ایک خوف ناک بھُوت سے کن حالات میں ہُوئی ؟
یہ آپ اس سلسلے کی اگلی کتاب
"حاتم طائی پیرس میں"
میں پڑھیں گے۔

حاتم طائی زندہ ہوگیا!



دکھیوں کا ہمدرد

بے کسوں کا سہارا

اپنے وقت کا سب سے زیادہ سخی اور بہادر انسان

جو 1500 سال پہلے عرب میں فوت ہوگیا تھا

دوبارہ زندہ ہوگیا ہے!

آپ اِس کے حیرت انگیز اور جرأت و بہادری سے بھرپور کارنامے پڑھتے وقت —— ہر ہر سطر پر، اُچھل اُچھل پڑیں گے ——

وہ، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر، ایک پاکستانی لڑکے کو بھارت کی قید سے چھڑاتا ہے، فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ مل کر اسرائیل کے فوجی اڈّے اُڑاتا ہے، لندن کے لوگوں کو ایک خوں خوار انسانی بھوت سے نجات دلاتا ہے۔

آپ کے جانے پہچانے ادیب اے حمید کے اس دِل چسپ اور حیرت انگیز ناول کے پانچ حصّے چھپ چکے ہیں ——

حاتم طائی لاہور میں ⁕ حاتم طائی دلّی میں ⁕ حاتم طائی پیرس میں

⁕ حاتم طائی لبنان میں ⁕ حاتم طائی لندن میں



فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ISBN:969 0 00264 3



Rs. 150.00